ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد ۱۸ ۔ شمارہ ۱۰ ۔ اکتوبر ۲۰۰۷

کلمہ حق

مذہب کا ریاستی کردار اور مغربی دانش ور — رئیس التحریر — ۲

اصلاح ودعوت

قرآن مجید کا موثر اور معجز طرز بیان — مولانا محمد سرفراز خان صفدر — ۶

ماہ رمضان اور قرآن مجید — مولانا صوفی عبد الحمید سواتی — ۷

آرا وافکار

سورۃ الانعام اور سورۃ النحل کا زمانہ نزول — محمد مشتاق احمد — ۸

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام — ڈاکٹر محمود الحسن عارف — ۲۱

عربی زبان وادب کی پس ماندگی — مولانا محمد بشیر سیالکوٹی — ۲۷

مباحثہ ومکالمہ

امہات المومنین اور آیت حجاب کا حکم — محمد رفیق چودھری — ۳۴

لال مسجد کا سانحہ، علماء عظام اور صدر مشرف — مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی — ۳۸

مکاتیب — قاضی محمد رویس خان ایوبی — ۴۳

اخبار وآثار

''ملی مجلس شرعی'' کا قیام / مولانا زاہد الراشدی کی وطن واپسی — ۴۶

''مسلم دنیا کے ان حکمرانوں اور دانش وروں کے حوصلہ کی داد دینا پڑتی ہے جو ابھی تک مسلسل یہ واویلا کیے جا رہے ہیں کہ مغرب اور مسلم دنیا کے درمیان اس کشمکش کا عقیدہ وثقافت اور کلچر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کے ہر تجزیہ کی تان اس نکتہ پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ مسلمانوں کو اور خصوصاً ان کے دینی حلقوں اور مذہبی راہ نماؤں کو مغرب کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔'' [کلمہ حق]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب کا ریاستی کردار اور مغربی دانش ور

نیو یارک سے شائع ہونے والے اردو جریدہ ہفت روزہ ''نیو یارک عوام'' نے ۳۱ راگست تا ۶ ر ستمبر ۲۰۰۷ کی اشاعت میں بتایا ہے کہ اقوام متحدہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سفیر زلمے خلیل زاد نے آسٹریا کے ایک اخبار ''آئی پریس'' کو انٹرویو دیتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں تیزی سے ابتر ہوتی ہوئی صورت حال تیسری عالمی جنگ کا باعث بن سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی موجودہ صورت حال ابتری کے حوالے سے ایسے نقطے پر پہنچ چکی ہے جس نقطے پر بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں یورپ کی صورت حال تھی اور یہ صورت حال دو عالمی جنگوں کا باعث بنی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مشرق وسطیٰ میں سیاسی اتار چڑھاؤ جو اس وقت انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہے اور اسلامی تہذیب تیسری عالمی جنگ کی وجہ بن سکتی ہے۔ زلمے خلیل زاد نے یہ بھی کہا کہ اسلامی تہذیب بالآخر عالمی دھارے میں شامل ہو جائے گی تاہم اس عمل میں کچھ وقت لگے گا۔

''نیو یارک عوام'' کے اسی شمارے میں امریکی فوج کے سربراہ جنرل ارج کیسی کے ایک خطاب کی رپورٹ بھی شائع ہوئی ہے جو انھوں نے سان جوآن میں نیشنل گارڈ ایسوسی ایشن کی ۱۲۹ ویں سالگرہ میں کیا ہے اور جس میں انھوں نے کہا ہے کہ انتہا پسند مسلمانوں کے خلاف شروع کی گئی نظریاتی جنگ کئی عشروں تک جاری رہ سکتی ہے اور یہ جنگ اس وقت تک نہیں جیتی جا سکتی جب تک اعتدال پسند مسلمان انتہا پسند مسلمانوں پر بالادستی نہ حاصل کر لیں، اس لیے سرد جنگ کے دور کی طرح یہ نظریاتی جنگ بھی کئی عشروں تک جاری رہ سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ''نیو یارک پولیس ڈیپارٹمنٹ'' کی اس رپورٹ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جس کا ان دنوں امریکی حلقوں میں بہت چرچا ہے۔ یہ رپورٹ ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا اعلان نیو یارک کے پولیس کمشنر ریمون کیلی نے پریس کانفرنس میں کیا ہے اور اس میں امریکہ کے اندر دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے خطرے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہفت روزہ ''پاکستان نیوز'' نے، جو نیو یارک سے شائع ہوتا ہے، ۲۳-۲۹ راگست ۲۰۰۷ کے شمارے میں اس کے کچھ حصے شائع کیے ہیں۔ پولیس کمشنر ریمون کیلی نے اخباری کانفرنس میں بتایا کہ اس رپورٹ کو تیار کرنے کے لیے نیو یارک پولیس افسروں نے دنیا بھر کا دورہ کیا ہے اور ۱۰۰ دہشت گردوں اور دہشت گردی کے گیارہ منصوبوں کے مطالعہ کے بعد یہ رپورٹ تیار کی گئی ہے۔ اس میں دہشت گردی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے کہ کن مراحل سے گزر کر کوئی دہشت گرد مکمل دہشت گرد کا روپ دھار لیتا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خطرہ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص زیادہ مذہبی ہو جائے،

ڈاڑھی بڑھالے، لڑکیوں اور نشے سے دوری اختیار کرلے، امریکن پاپ کلچر سے بیزاری ظاہر کرے اور وار گیم کھیلنے شروع کر دے۔ ایسے نوجوان اپنے خاندان سے تعلقات کم کر لیتے ہیں اور ایسی مساجد میں جانا بند کر دیتے ہیں جو کہ شدت پسند نہیں ہوتیں۔ اس کے بجائے وہ شدت پسند مساجد میں جاتے ہیں۔

تحقیقاتی افسر کا کہنا ہے کہ اگر ''کوئی مسجد جانا چھوڑ دے تو بظاہر لگتا ہے کہ اچھی بات ہے'' مگر یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے مسجد آنا اس لیے چھوڑا ہو کہ وہ اتنی شدت پسند نظریات والے نہیں ہیں۔ رپورٹ میں نوجوانوں کے دہشت گردی کی طرف مائل ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کسی کی نوکری چھوٹ جائے، نوکری پر تعصب کا شکار ہو جائے، کوئی جانی نقصان ہو جائے، والدین کا انتقال ہو جائے یا پھر کوئی ایسا شخص جو مسلم دنیا پر ہونے والی زیادتی سے ناراض ہو۔

یہ تین رپورٹیں مغرب اور عالم اسلام کے درمیان جاری کشمکش کے بارے میں خود مغربی راہ نماؤں کی طرف سے ظاہر کیے جانے والے خیالات کی ایک جھلک کی حیثیت رکھتی ہیں، ورنہ اگر مغرب میں شائع ہونے والے اخبارات اور جرائد کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اس جیسے بیسیوں بیانات، مضامین اور رپورٹوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جن کی رو سے مغرب کے ذمہ دار دانش وروں، حکمرانوں اور تجزیہ نگاروں کے نزدیک اس کشمکش اور تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی کے اسباب کی جڑیں عقیدہ، ثقافت اور کلچر میں پیوست ہیں اور اپنے اسباب، معروضی صورت حال اور نتائج کے حوالے سے یہ واضح طور پر ایک کلچرل اور عقیدہ وثقافت کی جنگ دکھائی دیتی ہے، مگر مسلم دنیا کے ان حکمرانوں اور دانش وروں کے حوصلہ کی داد دینا پڑتی ہے جو ابھی تک مسلسل یہ واویلا کیے جا رہے ہیں کہ مغرب اور مسلم دنیا کے درمیان اس کشمکش کا عقیدہ وثقافت اور کلچر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کے ہر تجزیہ کی تان اس نکتہ پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ مسلمانوں کو اور خصوصاً ان کے دینی حلقوں اور مذہبی راہ نماؤں کو مغرب کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے، مغرب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی طرف پیش رفت کرنی چاہیے۔

ہم ان صفحات میں کئی بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ مغرب نے آسمانی تعلیمات سے انحراف اور ریاست وسوسائٹی کے معاملات سے مذہب کی بے دخلی پر مبنی جس سولائزیشن کو گزشتہ دو صدیوں میں پروان چڑھایا ہے، وہ اسے دنیا پر اپنے سیاسی، عسکری اور معاشی غلبے کی وجہ سے ''واحد عالمی سولائزیشن'' قرار دے کر اسے میڈیا، لابنگ، عسکری بالادستی اور معاشی تسلط کے ذریعے دنیا بھر سے منوانے کے درپے ہے اور مسلم دنیا چونکہ اپنے عقیدہ وثقافت اور قرآن وسنت کی تعلیمات سے بے لچک وابستگی کے باعث سوسائٹی اور ریاست کے معاملات میں ان کے راہ نمائی کے کردار سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے، اس لیے وہ اس کی مزاحمت کر رہی ہے اور جیسا کہ مظلوم، مقہور اور بے بس شخص مزاحمت پر اتر آنے کے بعد جو چیز اس کے ہاتھ میں آ جائے، اسی کو ہتھیار بنا لیتا ہے، اسی طرح ہر طرف سے جکڑی ہوئی مسلم دنیا کا ایک حصہ اس حصار کی رسیوں کو کاٹنے کے لیے جو اس کے بس میں ہے، وہ کیے جا رہا ہے۔

آپ ایک لمحہ کے لیے تصور کیجیے کہ ایک شخص رسیوں سے جکڑا ہوا دشمن کے سامنے پڑا ہے اور دشمن خنجر ہاتھ میں لیے اس کے سر پر کھڑا ہے، وہ شخص خود کو اس صورت حال سے نجات دلانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرے گا؟ وہ تڑپے گا، بھاگنے کی کوشش کرے گا، رسیوں کو توڑنے کے لیے دانتوں اور ناخنوں کا استعمال کرے گا، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو پتھروں پر رگڑے گا اور جسم

کے جس حصے کو حرکت دینے کی پوزیشن میں ہوگا، اسے وہ دشمن کے خلاف استعمال کرے گا۔ اس وقت اگر آپ ریفری بن کر سامنے کھڑے ہوں اور اسے سمجھانا شروع کر دیں کہ اس طرح تمھارے دانت ٹوٹ جائیں گے، ناخن اکھڑ جائیں گے، جسم چھلنی ہو جائے گا اور ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی تو آپ خود اپنے ضمیر سے پوچھ لیجیے کہ آپ کے اس طرز عمل کو کس عنوان سے تعبیر کیا جانا چاہیے؟

ہم کبھی دہشت گردی اور انتہا پسندی کے حق میں نہیں رہے۔ ہم نے ہمیشہ اعتدال و توازن اور پرامن جدوجہد کی بات کی ہے اور اس کی حمایت کی ہے۔ اب بھی ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں عام شہریوں اور غیر متعلق اور بے گناہ لوگوں کی جان و مال کو خطرے میں ڈالنے کے عمل کو قابل نفریں سمجھتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مسلم ممالک میں مسلم حکومتوں کے خلاف مسلح جدوجہد کو بھی درست نہیں سمجھتے اور مسلم معاشروں کی اصلاح اور مسلم ممالک میں اسلامی اقدار و روایات کے نفاذ و تحفظ کے لیے پرامن جدوجہد کو ہی صحیح اور معقول راستہ تصور کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم ان زمینی حقائق کو بھی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں کہ:

--- o مغرب اس وقت مسلم دنیا میں سیاسی، معاشی اور عسکری غلبہ کے زور سے جو کچھ کر رہا ہے، اس کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں کو اسی طرح آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کے معاشرتی اور ریاستی کردار سے دست بردار ہونے پر مجبور کرنا ہے جس طرح مغرب خود یہ دست برداری اختیار کر چکا ہے۔

--- o مغرب نے ''دہشت گردی'' کا کوئی مفہوم عالمی سطح پر طے کیے بغیر دہشت گردی کے خلاف جو جنگ شروع کر رکھی ہے، اس نے دہشت گردی اور تحریک آزادی کے معاملات کو آپس میں گڈمڈ کر دیا ہے جس سے مظلوم اور غلام قوموں کا خود ارادیت اور آزادی کا حق مجروح ہو رہا ہے۔

--- o مختلف ممالک میں غیر ملکی فوجی تسلط کے خلاف مزاحمت کرنے والے ''فریڈم فائٹرز'' کو دہشت گرد قرار دے کر قوموں کی آزادی اور خودمختاری کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

البتہ صورت حال میں ایک مثبت تبدیلی کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہوئے ہیں جو ہمارے لیے کسی حد تک اطمینان کا باعث ہے۔ وہ یہ کہ سوسائٹی اور ریاست کے معاملات میں مذہب کے کردار کا خلا اب مغرب میں بھی محسوس کیا جانے لگا ہے اور امریکی دانش وروں کے ایک فکری فورم کے ساتھ ہمیں اس سلسلے میں ابتدائی گفتگو کا موقع ملا ہے۔ راقم الحروف نے اس سال شعبان المعظم کا بیشتر حصہ واشنگٹن کے ایک دینی ادارے ''دارالہدیٰ'' میں گزارا ہے اور اسی دوران میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بہت سے امریکی دانش وراس پہلو پر کام کر رہے ہیں کہ ریاست کے ساتھ مذہب کا تعلق ختم ہونے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پر کرنے کے لیے کوئی راستہ نکالا جائے۔ اس سلسلے میں دو امریکی دانش وروں ڈگلس جانسٹن اور سینتھیا سمپسن کی مشترکہ طور پر لکھی ہوئی ضخیم کتاب: "Religion: The Missing Dimension of State Craft" اسی حلقہ کے ایک دوست نے مجھے فراہم کی۔ اس کا پیش لفظ سابق امریکی صدر جمی کارٹر نے تحریر کیا ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں مذہب کے ریاستی کردار کی اہمیت پر بات کی گئی ہے۔ اس کتاب کی دیگر تفصیلات اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں، مگر اس کا یہی پہلو میرے لیے کسی حد تک اطمینان بخش ہے کہ مغرب میں ریاست کے ساتھ مذہب کے تعلق کی اہمیت پر دانش وروں میں بحث

ہو رہی ہے۔ یہی نکتہ ہمارے دانش وروں کی توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے اور مسلم دانش وروں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اپنی صلاحیتیں مسلمانوں کو مذہب کے ریاستی کردار سے دست برداری کی تلقین کرنے کے بجائے مغرب کو مذہب کے ریاستی کردار کی بحالی کی اہمیت کا احساس دلانے میں صرف کریں کہ وقت کا سب سے اہم تقاضا یہی ہے۔

حضرت مولانا حسن جانؒ کی شہادت اور مولانا شفیق الرحمٰن درخواستی کی وفات

حضرت مولانا حسن جانؒ صاحب کی شہادت اور حضرت مولانا شفیق الرحمٰن درخواستی کی اچانک وفات کی خبر میں نے دارالہدیٰ واشنگٹن میں سنی۔ دونوں بزرگ ہمارے ملک میں حدیث نبوی کے بڑے اساتذہ میں سے تھے اور دونوں کی وفات دینی وعلمی حلقوں کے لیے صدمہ کے ساتھ ساتھ ناقابل تلافی نقصان کا بھی باعث ہے۔

حضرت مولانا حسن جان شہیدؒ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی معذوری اور وفات کے بعد ان کی مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور پھر پشاور صدر کی درویش مسجد میں دینی درس گاہ قائم کر کے علوم حدیث کی ترویج واشاعت کو زندگی بھر مشن بنائے رکھا۔ وہ سیاست میں بھی آئے اور خان عبدالولی خان مرحوم جیسی قدر آور شخصیت کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، لیکن سیاست انھیں راس نہیں آئی۔ وہ تو سیاست میں آئے لیکن سیاست ان میں آنے کا راستہ نہ پا سکی، بالآخر انھوں نے اسے طلاق بائن دے دی۔ وہ اس میدان کے بزرگ ہی نہیں تھے۔ ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی واحد جولان گاہ علم اور صرف علم تھا۔ اپنے مزاج کے حوالے سے وہ مرنجاں مرنج قسم کی شخصیت تھے۔ خدا جانے ان کے سفاک قاتلوں کو ان کی جان لینے میں کس پہلو سے دلچسپی تھی۔ بہر حال ہم ان کے قتل کی مذمت کرتے ہیں، ان کے قاتلوں کی گرفتاری اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور ان کے لیے جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات کی دعا کرتے ہوئے اہل خاندان، تلامذہ اور عقیدت مندوں کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں۔

حضرت مولانا شفیق الرحمٰن درخواستی ہمارے مخدوم ومحبوب امیر حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ کے نواسے اور ان کی علمی وتدریسی روایات کے امین تھے۔ انھوں نے حضرت درخواستی کے زیر سایہ تعلیم وتربیت حاصل کی اور پھر جامعہ مخزن العلوم والفیوض خان پور اور پھر ان کی موجودگی میں ان کی مسند تدریس پر بیٹھ کر ان کے تعلیمی وتدریسی سلسلہ کو جاری رکھا۔ بعد میں خان پور میں ہی جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ قائم کر کے تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ مسلکی حمیت سے مالا مال تھے اور دینی تحریکات کی ہمیشہ سرپرستی فرماتے تھے۔ ان کی اچانک وفات صرف درخواستی خاندان کے لیے نہیں بلکہ ملک بھر کے دینی وعلمی حلقوں کے لیے صدمہ کا باعث ہے، حضرت درخواستی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق وعقیدت کے حوالے سے بھی اور اس حوالے سے بھی کہ ہم قحط الرجال کے اس دور میں ایک باعمل عالم دین، باصلاحیت استاذ حدیث اور جذبہ حق گوئی سے بہرہ ور دینی راہ نما سے محروم ہو گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات سے نوازیں، ان کے اہل خاندان، تلامذہ اور عقیدت مندوں کو صبر جمیل کی توفیق دیں اور ان کے برادران وفرزندان کو ان کا علمی صدقہ جاریہ تادیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا الٰہ العالمین

شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر

قرآن مجید کا موثر اور معجز طرز بیان

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فرائض بیان کیے ہیں، ان میں ایک فریضہ تلاوت کتاب اللہ بھی ہے۔ چونکہ آپ کے اولین مخاطب اہل عرب تھے جن کی مادری زبان عربی تھی، جو اپنے وقت میں فصاحت و بلاغت اور نطق و بیان کے امام سمجھے جاتے تھے، اس لیے وہ محض قرآن پاک کی تلاوت ہی سے اس کا مطلب و مفہوم سمجھ لیتے تھے اور اس کی شیرینی اور ٹھوس دلائل سے لطف اندوز اور متاثر ہوتے تھے۔ قرآن کریم کا طرز ادا، اسلوب بیان اور ترغیب و ترہیب کا انداز اس قدر سادہ اور موثر ہے کہ اس سے جس طرح ایک بڑے سے بڑا فلسفی محظوظ ہوتا ہے، اسی طرح اس کے دل کش بیان سے اونٹوں اور بکریوں کا چرواہا بھی اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور جیسے ایک ماہر فلسفی اور عالم اس کے انداز بیان پر داد تحسین دینے پر مجبور ہے، اسی طرح ایک سادہ بدو بھی اس کے پند و موعظت اور رشد و ہدایت کے ہمہ گیر اصول پر صد آفرین کہنے پر مجبور ہے۔ یہ قرآن کریم ہی تھا جس نے پہاڑ جیسے مضبوط دلوں کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ان میں ایمان و اصلاح کا تخم بویا جس سے اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کے شیریں ثمرات نمودار ہوئے۔ قرآن کریم وہ اعلیٰ و اکمل کتاب ہے جس میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں۔ عبارت انتہائی سلیس و فصیح، اسلوب بیان نہایت موثر و شگفتہ اور تعلیم بے حد متوسط و معتدل ہے جو ہر زمانہ اور ہر طبیعت کے مناسب اور عقل سلیم کے بالکل مطابق ہے۔ اس میں افراط و تفریط کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے۔ اس کا ہر مضمون جچا تلا ہے۔

قرآن کریم کے ذریعے سے جب وحی الٰہی کی بارش ہوتی ہے تو تسلیم کرنے والوں کے دلوں میں ایمان کا پودا اگتا، بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے اور اس کی بدولت رضائے الٰہی کے ثمرۂ شیریں سے لذت اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ قرآن پاک کی اس شیریں مقالی سے گھبرا کر کفار قریش یہ منصوبہ باندھنے پر کمر بستہ ہو گئے اور بالآخر اس پر عمل کر ہی دکھایا کہ ''نہ سنو اس قرآن کو اور اس کے سننے میں شور و غل مچا دو تا کہ تم غالب آ جاؤ''۔ (حم السجدۃ آیت ۲۶) اس سے بڑھ کر شکست کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے؟ اور اس سے یہ بھی بخوبی آشکارا ہو گیا کہ وہ لوگ بھی جو اپنی فصاحت و بلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، قرآن کریم کے دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ سے کس قدر بدحواس ہو جاتے تھے اور قرآن کریم کی آیات کی معجزانہ ادا نے ان کے لیے کس قدر مشکلات پیدا کر دی تھیں۔

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی

ماہ رمضان اور قرآن مجید

قرآن پاک کے رمضان المبارک میں نزول کے متعلق حضرات عبداللہ بن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قران پاک کو ماہ رمضان کی ایک رات، لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے بیت العزت میں اتارا اور پھر وہاں سے پورے تیئس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ نزول قرآن کی اس رات کے متعلق خود رب العزت نے فرمایا: 'لیلۃ القدر خیر من الف شھر'، یہ تو ایک ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ اگر یہ میسر آ جائے تو اس ایک رات کی عبادت ۸۳ سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔ یہ بڑی فضیلت والی رات ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں کی فضیلت کے متعلق بھی بہت سی روایات آتی ہیں۔ مثلاً طبرانی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو نازل ہوئے، تورات ۶ رمضان کو اور انجیل ۱۳ رمضان کو نازل ہوئی جبکہ قرآن کریم ۲۴ رمضان کو نازل ہوا۔ یہ تفسیری روایات سے معلوم ہوا ہے۔ بہرحال رمضان المبارک کا قرآن پاک کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔

اس ماہ مبارک کو قرآن پاک کے ساتھ بطور یادگار خصوصی لگاؤ ہے، اسی لیے حکم ہے کہ اس مہینے میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے۔ اگرچہ محض تلاوت منتہائے مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے نصیحت پکڑی جائے، اس کے بتلائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ''مقصد از نزول قرآن محض تلفظ نیست''۔ اگرچہ اس زمانے میں محض تلاوت بھی غنیمت ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ جب کوئی شخص خلوص دل کے ساتھ تین حرف 'الـــم' پڑھتا ہے تو تیس نیکیوں کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کی اس قدر برکت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ جو بھی کلام یا اوراد ہیں، انھیں بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں، صرف کلام پاک ہی ایک ایسا کلام ہے جسے سمجھ کر یا بے سمجھے ہر حالت میں پڑھنے سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کے لیے صرف ایمان اور نیت صالحہ کی ضرورت ہے۔

محمد مشتاق احمد☆

سورۃ الانعام اور سورۃ النحل کے زمانۂ نزول کے تعین کا مسئلہ

شان نزول کی روایات اور سورتوں کی اندرونی شہادتیں

کتب تفاسیر میں بعض اوقات ایک ہی سورت کے متعلق شان نزول کی بہت سی روایات مل جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی آیت کے کئی اسباب نزول ذکر کیے جاتے ہیں۔ کبھی آیات کے مضامین کی اندرونی شہادت یہ ہوتی ہے کہ ان کا نزول مکہ میں ہوا تھا، لیکن شان نزول کی روایت میں مدنی دور کا واقعہ ذکر ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات سورت کے نظم کی گواہی یہ ہوتی ہے کہ پوری سورت بیک وقت نازل ہوئی مگر روایات میں بعض آیات کا الگ الگ شان نزول ذکر ہوتا ہے۔ اس قسم کی الجھنوں کے حل کے لیے امام الہند شاہ ولی اللہ نے جو تحقیق اپنے رسالے ''الفوز الکبیر فی علوم التفسیر'' میں پیش کی ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

صحابہ کرام اور دیگر متقدمین علما جب نزلت فی کذا اور اس قسم کی دیگر تراکیب استعمال کرتے تھے تو ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ بعینہ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا جو اس روایت میں بیان ہوا، بلکہ بعض اوقات ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ عہد نبوی یا اس کے بعد کا یہ واقعہ بھی اس آیت کا مصداق ہے۔ کبھی صحابہ کوئی سوال کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے نازل شدہ کسی آیت سے اس کا حکم مستنبط کر کے بیان فرما دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استنباط بھی دراصل وحی، القا اور نفث فی الروع کی قسم ہوتی، اس لیے اس طرح کے موقع پر فانزل اللہ تعالی قولہ کے الفاظ کا استعمال جائز ہوتا۔ کبھی صحابۂ کرام کے باہمی مباحثوں میں آیات سے استشہاد ہوتا یا بطور تمثیل ان کا ذکر ہوتا۔ اس قسم کی روایات کو بھی مفسرین اسباب نزول میں ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح صحابۂ کرام یہود، نصاریٰ، مشرکین اور دوسرے فرق ضالہ کی اعتقادی اور عملی برائیاں بیان کر کے کسی آیت کی تلاوت کرتے اور کہتے کہ نزلت فی کذا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ بعینہ یہی اعمال وعقائد ان آیات کے نزول کا سبب بنے، بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ اسی قسم کے عقائد اور اعمال کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ آیات ان عقائد اور اعمال پر بھی منطبق ہوتی ہیں۔ اسی طرح کبھی قرآن مجید میں اچھے اور برے لوگوں کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ ان صفات کا کسی خاص شخص یا اشخاص سے مخصوص کرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ عام طور پر جن میں بھی وہ صفات ہوں، وہ ان آیات کے مصداق شمار ہوں گے۔

☆ لیکچرر کلیہ شریعہ وقانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ فی الجملہ مفسر کے لیے دو چیزوں کی معرفت ضروری ہے: ایک وہ واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ ہو کیونکہ ان کے علم کے بغیر آیات کے ایما کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ دوسرے وہ واقعات جن سے عام کی تخصیص ہوتی ہو یا اور کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ اس مؤخر الذکر اصول کو شاہ ولی اللہ علم توجیہ اور تاویل سے متعلق کر دیتے ہیں۔ (۱)

شاہ صاحب کی رائے کوئی انوکھی یا منفرد رائے نہیں ہے۔ یہی رائے دیگر محققین علما نے بھی اختیار کی ہے۔ (۲) اس اصولی تحقیق کو ماننے کے باوجود مفسرین بالعموم شان نزول کی روایات کو ان کے ظاہری مفہوم کے ساتھ قبول کر کے انہیں سورت کی اندرونی شہادتوں پر فوقیت دیتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بعض سورتوں کا نزول ٹکڑوں میں ہوا۔ یہ بھی مسلم ہے کہ بعض سورتوں کے چند ٹکڑے ہجرت سے قبل اور چند ٹکڑے ہجرت کے بعد نازل ہوئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان ٹکڑوں کی پہچان کے لیے سورت کے اندر کوئی نشانی نہیں پائی جاتی۔ نیز ان دونوں حقائق کے ساتھ ساتھ ایک تیسری حقیقت بھی مسلم ہے کہ بہت سی سورتوں کا نزول یک بارگی ہوا ہے۔ پس کسی سورت کی مختلف آیات کے متعلق محض یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ چونکہ بعض سورتیں ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں، اس لیے یہ بھی ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ اس کے جواب میں بالکل برابر کی سطح پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ بعض سورتیں پوری کی پوری بیک وقت نازل ہوئی ہیں، اس لیے یہ سورت بھی یک بارگی ہی نازل ہوئی ہوگی۔ گویا ہر سورت کے متعلق الگ سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ پوری کی پوری یک بارگی نازل ہوئی یا اس کا نزول ٹکڑوں میں ہوا، اور اگر ٹکڑوں میں ہوا تو وہ ٹکڑے کب نازل ہوئے؟ اس سلسلے میں شان نزول کی روایات سے یقیناً مدد لی جا سکتی ہے، لیکن کیا سورت کی اندرونی شہادتوں مثلاً سورت کے نظم اور آیات کے سلسلۂ بیان کی بھی اس ضمن میں کچھ اہمیت ہے؟ اگر شان نزول کی روایت اور سورت کی اندرونی شہادت متصادم ہوں تو پھر ترجیح کسے دی جائے گی؟ کیا سورت کی اندرونی شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے شان نزول کی روایت کی اسی طرح تاویل کی جائے گی جس طرح شاہ ولی اللہ اور دیگر محققین نے کی ہے یا شان نزول کی روایت کو قبول کرتے ہوئے سورت کی اندرونی شہادت نظر انداز کی جائے گی، یا اس کی تاویل کی جائے گی؟

مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ سورت کے زمانۂ نزول کے تعین کے لیے شان نزول کی روایات کے علاوہ سورت کی اندرونی شہادتوں کا بھی بعض مقامات پر تجزیہ کرتے ہیں۔ سورۂ ابراہیم کے زمانۂ نزول کا تعین کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''عام انداز بیان مکہ کے آخری دور کی سورتوں کا سا ہے۔ سورۂ رعد سے قریب زمانہ ہی کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً آیت ۱۳ کے الفاظ: و قال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا (انکار کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے) کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ اس وقت مکہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اہل مکہ پچھلی کافر قوموں کی طرح اپنے ہاں کے اہل ایمان کو خارج البلد کر دینے پر تل گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کو وہ دھمکی سنائی گئی جو ان کے سے رویہ پر چلنے والی پچھلی قوموں کو دی گئی تھی کہ لنھلکن الظلمین (ہم ظالموں کو ہلاک کر کے رہیں گے) اور اہل ایمان کو وہی تسلی دی گئی جو ان کے پیش روؤں کو دی جاتی رہی ہے کہ لنسکننکم الارض من بعدھم (ہم ان ظالموں کو ختم کرنے کے بعد تم ہی کو اس

سرزمین میں آباد کریں گے) اسی طرح آخری رکوع کے تیور بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے۔''(۳)

بسا اوقات وہ شان نزول کے متعلق مفسرین کے اقوال پر سورت کی اندرونی شہادتوں کو فوقیت دیتے ہیں۔ مثلاً سورۃ العنکبوت کے زمانۂ نزول کے متعلق وہ کہتے ہیں:

''آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ پس منظر میں اسی زمانہ کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ بعض مفسرین نے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا عملی ظہور مدینہ میں ہوا ہے، یہ قیاس قائم کر لیا کہ اس سورہ کی ابتدائی دس آیات مدنی ہیں اور باقی سورہ مکی ہے۔ حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نفاق کا ذکر ہے، وہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم وستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہو سکتا تھا نہ کہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورہ میں مسلمانوں کو ہجرت کی تلقین کی گئی ہے، اسے مکہ کی آخری نازل شدہ سورت قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تمام قیاسات دراصل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادتوں پر ان کی بنا رکھی گئی ہے اور یہ اندرونی شہادت، اگر پوری سورت کے مضامین پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے، مکہ کے آخری دور کی نہیں بلکہ اس دور کے حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں ہجرت حبشہ واقع ہوئی تھی۔''(۴)

بعض سورتوں کے زمانۂ نزول کی تحقیق میں مولانا مودودی روایات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک روایت کو دوسری پر فوقیت بھی دے دیتے ہیں۔(۵) سورۃ الانعام کی تفسیر کے دیباچے میں انہوں نے مکی سورتوں کے مضامین پر بڑی معرکہ آرا تحقیق کی ہے اور مکی دور کے مختلف ادوار متعین کیے ہیں۔(۶) تاہم انہوں نے تمام سورتوں میں تحقیق کا یہ معیار برقرار نہیں رکھا۔ مثلاً سورۃ البینۃ کے زمانۂ نزول کے متعلق وہ پہلے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں:

''اس کے بھی مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ مکی ہے اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک مدنی ہے۔ ابن الزبیر اور عطاء بن یسار کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ ابن عباسؓ اور قتادہ کے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے، دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مکی قرار دیتی ہیں۔ ابو حیان صاحب بحر المحیط اور عبد المنعم ابن الفرس صاحب احکام القرآن اس کے مکی ہونے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔''(۷)

اس کے بعد سورت کی اندرونی شہادتوں کے متعلق اتنا کہہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں:

''جہاں تک اس کے مضمون کا تعلق ہے، اس میں کوئی ایسی علامت نہیں پائی جاتی جو اس کے مکی یا مدنی ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہو۔''(۸)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ سورت کے زمانۂ نزول کے تعین کے لیے سورت کی اندرونی شہادتوں اور نظم کی طرف

بھرپور توجہ دیتے ہیں اور انہوں نے اپنے استاد حمید الدین فراہیؒ سے ایک قدم آگے بڑھا کر یہ طے کیا ہے کہ قرآن مجید کی سورتیں سات گروپوں میں تقسیم ہیں جن میں ہر گروپ کا اپنا ایک الگ مضمون ہوتا ہے۔ ہر گروپ کا آغاز ایک یا زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور ہر گروپ کا اختتام ایک یا زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحی نے گروپوں کی جو تقسیم کی ہے اور ان میں مدنی اور مکی سورتوں کی جس طرح تقسیم کی ہے، وہ حسب ذیل ہے:

پہلا گروپ: الفاتحۃ تا المآئدۃ۔ اس گروپ میں صرف الفاتحۃ مکی ہے۔ باقی چار سورتیں مدنی ہیں۔

دوسرا گروپ: الانعام تا التوبۃ۔ اس گروپ میں دو سورتیں الانعام اور الاعراف مکی ہیں جبکہ دو سورتیں الانفال اور التوبۃ مدنی ہیں۔

تیسرا گروپ: یونس تا النور۔ اس گروپ میں مولانا اصلاحی کی تحقیق کے مطابق آخری سورت النور کے ماسوا باقی تمام سورتیں مکی ہیں۔ سورۃ الحج کی صرف چار آیات کو مدنی مانتے ہیں اور مجموعی لحاظ سے وہ اسے مکی دور کے آخر کی سورت قرار دیتے ہیں۔

چوتھا گروپ: الفرقان تا الاحزاب۔ اس میں بھی آخری سورت کے ماسوا باقی تمام سورتیں مکی ہیں۔

پانچواں گروپ: سبا تا الحجرات۔ اس میں سبا سے الاحقاف تک سورتیں مکی ہیں، جبکہ آخری تین سورتیں: محمد، الفتح اور الحجرات مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ: ق تا التحریم۔ اس گروپ میں ق تا الواقعۃ سات مکی سورتیں ہیں، جبکہ الحدید تا التحریم دس مدنی سورتیں ہیں۔

ساتواں گروپ: الملک تا الناس۔ اس گروپ میں مولانا اصلاحی کی تحقیق کے مطابق الملک تا الکافرون مکی سورتیں ہیں، جبکہ آخری پانچ سورتیں: النصر، لہب، الاخلاص، الفلق اور الناس مدنی ہیں۔ (۹)

مولانا اصلاحی قرار دیتے ہیں کہ ان میں ہر گروپ کا اپنا الگ موضوع اور مضمون ہوتا ہے اور گروپ کی ہر سورت اس مرکزی مضمون کے کسی خاص پہلو کی وضاحت کرتی ہے۔ وہ یہ بھی قرار دیتے ہیں کہ ہر گروپ کے اندر گروپ کے مضمون کا بتدریج ارتقا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک گروپ کے اندر سورتوں کی ترتیب نزولی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ النسآء اور سورۃ المآئدۃ ایک ہی گروپ میں یکے بعد دیگرے رکھی گئی ہیں، اس لیے سورۃ النسآء سورۃ المآئدۃ سے قبل نازل ہوئی۔

مولانا اصلاحی سورتوں کے باہمی ربط، گروپ کے مضمون، سورت کی اندرونی شہادتوں، نظم اور آیات کے سلسلۂ بیان پر تدبر کر کے سورت کا زمانۂ نزول متعین کرتے ہیں اور اس سلسلے میں یقیناً انہوں نے بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔ تاہم زمانۂ نزول کے تعین میں وہ بالعموم روایات کا تجزیہ نہیں کرتے۔

سورتوں کے زمانۂ نزول کے تعین میں نظمِ قرآن سے استدلال کے طریق کار کو مولانا اصلاحی کے شاگرد جناب جاوید احمد غامدی نے مزید آگے بڑھایا ہے۔ مثلاً سورتوں کے آخری گروپ (سورۃ الملک تا سورۃ الناس) کے زمانۂ نزول کو انہوں نے پانچ مراحل میں تقسیم کیا ہے اور طے کیا ہے کہ سورۃ الملک تا سورۃ الجن ''مرحلۂ انذار'' میں نازل ہوئیں۔ سورۃ المزمل تا

سورۃ الم نشرح ''مرحلۂ انذار عام'' سے تعلق رکھتی ہیں۔ سورۃ التین تا سورۃ الکوثر ''اتمام حجت'' کے دور کی ہیں۔ سورۃ الکافرون تا سورۃ الاخلاص ''براءت وہجرت'' کے مرحلے کی سورتیں ہیں۔ یہ تمام مراحل مکی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخری دوسورتیں، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس، مدنی دور کی ابتدا میں نازل ہوئیں۔ (۱۰)

سورۃ الانعام اور سورۃ النحل کا زمانۂ نزول

سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ میں بظاہر اشارہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الانعام کا نزول پہلے ہوا۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (النحل، آیت ۱۱۸)

''اور جو یہودی ہوئے، ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔''

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَالِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ (الانعام، آیت ۱۴۶)

''اور جو یہودی ہوئے، ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ ہو یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں۔''

لیکن دوسری طرف سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۹ میں بظاہر اشارہ سورۃ النحل کی آیت ۱۱۵ کی طرف ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ النحل کا نزول پہلے ہوا۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (سورۃ الانعام، آیت ۱۱۹)

''اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جب کہ اس نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں وہ چیزیں جو اس نے تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔''

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النحل، آیت ۱۱۵)

''اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حرام ٹھہرایا ہے۔ پس جو کوئی مجبور ہو جائے، نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

اس مسئلے کے حل کے لیے ہم نے مختلف قدیم اور جدید تفاسیر کا مطالعہ کیا اور مفسرین کرام کی کاوشوں کا جائزہ لیا تو

معلوم ہوا کہ شان نزول کی روایات اور آیات کی اندرونی شہادتوں کے درمیان توافق وترجیح کے مسئلے کی شاید سب سے اچھی مثال یہی ہے۔ نیز اس اشکال کے حل سے تورات کے نزول کے متعلق بھی ایک اہم حقیقت ثابت ہوتی ہے۔

امام آلوسی نے سورۃ الانعام کے شان نزول کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت پوری کی پوری ایک ہی رات کو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد آلوسی نے بعض دیگر اقوال بھی نقل کیے ہیں جن کے مطابق اس سورت کی چند آیات مدنی ہیں۔ کسی روایت میں آیات ۱۹۔۲۰ کو، کسی میں صرف آیت ۱۱۱ کو، کسی میں آیات ۱۵۱ تا ۱۵۳ کو اور کسی میں آیات ۱۹ تا ۲۱ اور آیات ۱۵۱ تا ۱۵۳ کو مدنی قرار دیا گیا ہے۔ (۱۱) تاہم سورت کے نظم اور آیات کے مضامین اور سلسلۂ بیان کو مدنظر رکھا جائے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے ہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ پوری کی پوری سورت ایک ہی موقع پر نازل ہوئی۔ جہاں تک بعض آیات کے مدنی ہونے کے متعلق روایات کا تعلق ہے، اگر شان نزول کی روایات کے متعلق علمائے محققین کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے تو ان کی توجیہ بہت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ یہی بات ان روایات کے متعلق کہی جا سکتی ہے جن میں سورۃ الانعام کی بعض آیات کا الگ الگ شان نزول بیان ہوا ہے۔

سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا اشارہ سورۃ الانعام کی طرف ہے۔ یہاں ہم سورۃ النحل کی آیت ۱۱۵ سے ۱۱۸ تک نقل کر دیتے ہیں تاکہ آیت ۱۱۸ کا سیاق بھی معلوم ہو:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَـٰذَا حَلَالٌ وَهَـٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَـٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (النحل، آیت ۱۱۵۔۱۱۸)

''اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حرام ٹھہرایا ہے۔ پس جو کوئی مجبور ہو جائے، نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لیے چند روزہ عیش اور پھر دردناک عذاب ہے۔ اور جو یہودی ہوئے، ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔''

آیت ۱۱۸ کے الفاظ کی سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کے الفاظ کے ساتھ ظاہری مشابہت کی بنا پر عام طور پر مفسرین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ سورۃ النحل کا اشارہ سورۃ الانعام ہی کی طرف ہے۔ مثال کے طور پر امام ابن الجوزی کہتے ہیں:

"یعنی بہ ما ذکر فی الانعام و ھو قولہ تعالی : و علی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر۔'' (۱۲)

امام قرطبی بھی اسی کے قائل ہیں۔ (۱۳) یہی رائے امام بیضاوی نے قائم کی ہے۔ (۱۴) امام آلوسی بھی اسی کے قائل ہیں۔ (۱۵) امام طبری نے اس قول کو عکرمہ اور قتادہ جیسے ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے۔ (۱۶)

اگر یہ بات تسلیم کی جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ سورۃ الانعام کا نزول سورۃ النحل سے پہلے ہوا تھا۔ اب سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۹ پر بھی نظر ڈالیں:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (سورۃ الانعام، آیت ۱۱۹)

''اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جب کہ اس نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں وہ چیزیں جو اس نے تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔''

یہ تفصیل قرآن مجید میں چار مقامات پر ذکر ہوئی ہے: سورۃ الانعام، آیت ۱۴۵؛ سورۃ النحل، آیت ۱۱۵؛ سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۳، اور سورۃ المآئدۃ، آیت ۳۔

اب یہاں چار امکانات ہیں:

(۱) سورۃ الانعام کے اس اشارے کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۳ کی طرف مانا جائے؛

(۲) اسے سورۃ المآئدۃ کی آیت ۳ کی طرف مانا جائے؛

(۳) اسے سورۃ الانعام ہی کی آیت ۱۴۵ کی طرف مانا جائے؛ یا

(۴) اسے سورۃ النحل کی آیت ۱۱۵ کی طرف مانا جائے۔

پہلی دو صورتوں میں ماننا پڑے گا کہ سورۃ البقرۃ یا سورۃ المآئدۃ کی مذکورہ آیت مکی ہے، لیکن دونوں سورتوں میں آیات کا سیاق وسباق اور نظم اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں۔ تیسری صورت مانی جائے تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگرچہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ تلاوت میں آیت ۱۱۹ سے مؤخر ہے مگر یہ نزول میں اس سے مقدم ہے۔ گویا نہ صرف یہ کہ ایک ہی سورت کی آیات کی ترتیب تلاوت اور ترتیب نزول میں فرق کو تسلیم کرنا ہوگا بلکہ یہ بھی ماننا ہوگا کہ سورۃ الانعام کی آیات کئی ٹکڑوں میں نازل ہوئیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ سورت کے نظم کے خلاف ہے بلکہ شان نزول کی روایات سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ چوتھی صورت مانی جائے تو ماننا پڑے گا کہ سورۃ النحل کا نزول سورۃ الانعام سے قبل ہوا تھا۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ کا اشارہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا صرف ایک ہی امکان ہے اور وہ یہ کہ یہ مانا جائے کہ پہلے سورۃ النحل کی آیت ۱۱۵ نازل ہوئی، پھر سورۃ الانعام نازل ہوئی، اس کے بعد سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ نازل ہوئی۔ لیکن کیا سورۃ النحل کی آیات کا نظم اس بخیہ گری کی اجازت دیتا ہے؟

مولانا مودودی نے اس اشکال کا ذکر کیا ہے اور یہی حل پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورۂ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیت [۱۱۹] میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقع پر کفارِ مکہ نے سورۂ نحل کی ان آیتوں پر وہ اعتراضات عائد کیے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس وقت سورۂ انعام نازل ہو چکی تھی، اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے، یعنی

سورۂ انعام میں بتا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں۔ اور چونکہ یہ اعتراض سورۂ نحل پر کیا گیا تھا، اس لیے اس کا جواب بھی سورۂ نحل ہی میں جملۂ معترضہ کے طور پر درج کیا گیا۔'' (۱۷)

یہی رائے مولانا اشرف علی تھانوی نے قائم کی ہے۔ وہ اس اشارے کا سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۵ کی طرف ہونا بعید اور سورۃ المآئدہ آیت ۳ کی طرف ہونا مستحیل قرار دیتے ہیں۔ (۱۸) لیکن چونکہ وہ بھی یہی قرار دیتے ہیں کہ سورۃ النحل آیت ۱۱۸ کا اشارہ سورۃ الانعام آیت ۱۴۶ کی طرف ہے، اس لیے وہ اس پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ قرار دیں کہ یہ آیات مختلف ٹکڑوں میں نازل ہوئیں۔

یمکن ان یکون تقدم النحل علی الانعام باعتبار اکثر الاجزاء لا کلها، و یکون قوله تعالی: و علی الذین هادوا حرمنا ما قصصنا الخ متأخراً عن سورة الانعام، لاسیما عن قوله تعالی: و علی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ، فافهم۔ (۱۹)

لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، سورۃ النحل کی آیات ۱۱۵ تا ۱۱۸ کے سلسلۂ بیان اور نظم کی قطعی شہادت یہ ہے کہ یہ آیات ایک ہی موقع پر نازل ہوئی ہیں۔ پھر اس اشکال کا حل کیا ہو سکتا ہے؟

بعض مفسرین نے یہ رائے اختیار کی کہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۹ کا اشارہ سورۃ المآئدۃ آیت ۳ کی طرف ہے لیکن اس پر یہ اعتراض ہوا کہ سورۃ المائدۃ تو مدنی ہے۔ (۲۰) امام قرطبی نے بھی اس اعتراض کا ذکر کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ فصّل کو یفصّل سمجھا جائے تو پھر یہ اشارہ سورۃ المائدۃ کی طرف ہو سکتا ہے۔ (۲۱) لیکن اس تاویل کا ضعف نہایت واضح ہے کیونکہ آیت میں لوگوں کو توبیخ کی جا رہی ہے کہ تمہارے لیے حرام ذبائح کا حکم پہلے ہی سے واضح کیا جا چکا ہے، پھر بھی تم اس حلال ذبیحے کے کھانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہو جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو! اگر فعل ماضی کو فعل مضارع میں تبدیل کیا جائے تو یہ توبیخ بالکل ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔

امام آلوسی نے خود یہ رائے اختیار کی کہ یہ اشارہ سورۃ الانعام ہی کی آیت ۱۴۵ کی طرف ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوا کہ آیت ۱۴۵ تو آیت ۱۱۹ کے بعد ہے۔ آلوسی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ تلاوت میں مؤخر ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ نزول میں بھی مؤخر ہے۔ (۲۲) لیکن بصد ادب و احترام گزارش ہے کہ یہ بات نہایت ضعیف ہے کیونکہ اولاً تو تلاوت میں مؤخر ہونے کی وجہ سے اصولاً یہ احتمال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ نزول میں بھی مؤخر ہے، اس لیے جو اسے نزول میں مقدم کہتے ہیں ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کے حق میں قوی دلیل پیش کریں۔ ثانیاً ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ سورۃ الانعام کا نظم اور آیات کا سلسلۂ بیان قطعی شہادت دیتے ہیں کہ یہ پوری کی پوری سورت بیک وقت نازل ہوئی ہے، اور یہی بات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہوئی ہے۔ خود امام آلوسی نے سورۃ الانعام کے نزول کے متعلق جو روایات نقل کی ہیں، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۱۱۹ اور آیت ۱۴۵ کا نزول ایک ہی موقع پر ہوا ہے۔ جن بعض آیات کے مدنی ہونے کے متعلق انہوں نے روایات نقل کی ہیں، ان میں آیت ۱۴۵ انہیں ہے۔

ان چاروں اقوال کی بنا یہ امر ہے کہ سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ کا اشارہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف ہے کیونکہ ان کے الفاظ میں بھی ظاہری مشابہت ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی قول مانا جائے تو سورت کی آیات کے سلسلۂ بیان اور

نظم کو توڑنا پڑتا ہے۔ بعض مفسرین نے ایک پانچواں امکان بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ سورۃ الانعام آیت ۱۱۹ میں اشارہ وحی غیر متلو میں بیان شدہ احکام کی طرف ہے۔ (۲۳) لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض بات بنانا ہی ہے۔ یہ قول محض اس وجہ سے وجود میں آیا ہے کہ چاروں اقوال کی غلطی واضح تھی اور کوئی اور حل نظر نہیں آیا۔ لیکن کیا کوئی اور حل نہیں ہے؟ کیا سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ کے اشارے کو سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کے بجائے سورۃ النحل ہی کی آیت ۱۱۵ کی طرف سمجھا جا سکتا ہے؟ یہاں ہم یہ آیات پھر نقل کر دیتے ہیں:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَـٰذَا حَلَالٌ وَهَـٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَـٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (النحل، آیت ۱۱۵۔۱۱۸)

''اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حرام ٹھہرایا ہے۔ پس جو کوئی مجبور ہو جائے، نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لیے چند روزہ عیش اور پھر دردناک عذاب ہے۔ اور جو یہودی ہوئے، ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''یعنی اصلاً یہود پر بھی وہ چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں جو اوپر آیات ۱۱۵ میں مذکور ہوئیں لیکن پھر انہوں نے خود اپنے جی سے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیں جو ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کر دی گئیں۔ خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔'' (۲۴)

مفسرین نے چونکہ بالعموم سورۃ النحل آیت ۱۱۸ کے اشارے کو سورۃ الانعام آیت ۱۴۶ کی طرف سمجھا ہے، اس لیے وہ اس بحث میں پڑ گئے کہ سورۃ الانعام آیت ۱۱۹ میں اشارہ کس طرف ہے؟ اگر یہ بات تسلیم کی جائے کہ سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ کا اشارہ سورۃ النحل ہی کی آیت ۱۱۵ کی طرف ہے تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ پھر سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۹ کے اشارے کو سورۃ النحل کی آیت ۱۱۵ کی طرف ماننے میں کوئی اشکال پیش نہیں آتا، نہ ہی ان میں سے کسی بھی سورت کے نظم کو توڑنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور نہ ہی وحی غیر متلو میں مذکور احکام فرض کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا پہلے سورۃ النحل کا نزول ہوا جس میں بتایا گیا کہ شریعت ابراہیمی میں انعام (مویشیوں) میں اصلاً حرام چار چیزیں تھیں۔ یہی شریعت موسوی کا بھی حکم تھا۔ بعد میں ان پر مزید چیزیں ان کے اپنے ظلم کی وجہ سے حرام کی گئیں۔ یہ چیزیں جو اصل میں حلال تھیں لیکن یہود کے ظلم کی وجہ سے حرام کر دی گئیں، ان کی تفصیل سورۃ الانعام میں دے دی گئی جو بعد میں نازل ہوئی۔ سورۃ الانعام میں بعض

مسلمانوں کو بھی تو بیخ کی گئی جو مشرکین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بعض ان چیزوں کے کھانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے جنہیں شریعت نے حلال قرار دیا تھا۔ ان کو کہا گیا کہ تمہارے لیے حرام چیزوں کی وضاحت اور اضطرار کی حالت کا حکم پہلے ہی سے سورۃ النحل میں واضح کیا جا چکا ہے، پھر تم کیوں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہو؟

اس طرح دونوں سورتوں کے زمانۂ نزول کے تعین کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس قول کے ماننے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پھر ماننا پڑے گا کہ تورات کا نزول بھی قرآن ہی کی طرح تدریجی ہوا تھا نہ کہ یک بارگی۔ اس بات کی تھوڑی سی وضاحت یہاں پیش کی جاتی ہے۔

تورات کے احکام کا تدریجی نزول

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بعض طبعی وجوہات کی بنا پر اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا، تاہم یہ شریعت ابراہیمی میں حرام نہیں تھا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (آل عمران، آیت ۹۳)

''کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں۔ کہہ دو کہ لاؤ تورات اور پڑھو اس کو، اگر تم سچے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تورات کے نزول سے پہلے بنی اسرائیل کے لیے وہ سبھی چیزیں حلال تھیں جو شریعت ابراہیمی میں حلال سمجھی جاتی تھیں اور جو سلیم انسانی فطرت کے مطابق کھانے کی چیزیں (الطعام) سمجھی جاتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تورات میں یہ تصریح بھی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل پر جو مزید بعض چیزیں حرام کی گئیں، وہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے زمانے میں حرام نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کو چیلنج کیا گیا کہ اگر تم اس بات کو غلط سمجھتے ہو تو تورات لے آؤ اور اسے پڑھو۔

بائبل کے سِفر پیدائش میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کیے گئے بعض احکام بھی موجود ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کو دیے گئے۔ ان کو ''حضرت نوح علیہ السلام کا عہد نامہ'' کہا جاتا ہے۔ یہود کے بہت سے علما کی رائے یہ ہے کہ ''غیر قوموں'' کے لیے تورات کے تمام احکام پر عمل کرنا واجب نہیں بلکہ ان کی نجات کا دارومدار حضرت نوح علیہ السلام کے عہد نامے پر عمل ہے۔ (۲۵) اس عہد نامے میں جو احکام دیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

''سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے واسطے ہیں۔ میں نے ان سب کو نباتات کی طرح تمہیں دیا۔ مگر تم گوشت کو اس کے خون کے ساتھ مت کھانا، کیونکہ میں تمہارا خون ہر ایک جنگلی جانور سے اور ہر ایک آدمی کے ہاتھ سے طلب کروں گا۔ اس آدمی سے بھی جو اپنے بھائی کو مار ڈالے، میں آدمی کی جان طلب کروں گا۔'' (۲۶)

یہاں نباتات کی طرف اشارے اور جنگلی جانوروں کے ساتھ تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ''کھانے کے واسطے''

(الطعام) حلال جانوروں سے مراد مویشی (انعام) ہیں۔ یہی کچھ قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں مویشیوں میں اصلاً چار ہی چیزیں حرام تھیں: مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا:

قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً عَلىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقاً أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (الانعام، آیت ۱۴۵)

''کہہ دو میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا، بجز اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون، یا سؤر کا گوشت، کہ ان میں ہر چیز ناپاک ہے، یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی ابتدا میں یہی چار چیزیں حرام تھیں، جیسا کہ سورۃ النحل کی آیت ۱۱۸ میں ذکر ہوا ہے۔ بعد میں ان کے ظلم کی بنا پر ان پر مزید کئی چیزیں حرام کر دی گئیں۔ آیت ۱۱۸ کا اشارہ، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے واضح کیا گیا، سورۃ النحل ہی میں اس سے قبل آنے والی آیت ۱۱۵ کی طرف ہے۔ گویا آیات کا مجموعی پیغام یہ ہوا کہ یہود پر اصلاً یہی چار چیزیں حرام تھیں، لیکن بعد میں ان کے اپنے ظلم کی وجہ سے ان پر مزید کئی چیزیں حرام کر دی گئیں جن کی تفصیل سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ میں بیان کی گئی ہے۔ یہی بات سورۃ النسآء میں یوں کہی گئی ہے:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء، آیت ۱۶۰)

''پس جو یہودی ہوئے، ان کے ظلم ہی کے سبب سے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے پہلے حلال کی گئی تھیں۔''

اس کی وجہ یہود کا رویہ تھا۔ وہ طرح طرح کے سوالات کر کے خود ہی اپنے لیے مشکلات کھڑی کرتے تھے۔ اسی لیے مسلمانوں کو اس قسم کے سوالات سے روکا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ (المآئدۃ، آیت ۱۰۱۔۱۰۲)

''اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کی گئیں تو تمہیں گراں گزریں گی۔ اور اگر تم ان کی بابت ایسے زمانے میں سوال کرو گے جب قرآن اتر رہا ہو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر کیا، اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ اسی طرح کی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں پھر انہی کے سبب سے کافر ہو گئے۔''

اس کی ایک اور مثال گائے کے ذبح کا واقعہ ہے۔ ابتدا میں انہیں کوئی سی گائے ذبح کرنے کا حکم تھا۔ (۲۷) پھر انہوں نے طرح طرح کے سوالات کر کے اس حکم کو ایک مخصوص گائے کے ساتھ خاص کر لیا۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ چربی کی حرمت کے حکم کو یہود کے احبار کے تشدد نے اور بھی سخت کر دیا تھا۔ چنانچہ اسفار خمسہ میں جہاں چربی کی حرمت کا ذکر ملتا ہے وہاں نہ صرف یہ حکم انتہائی تعمیم کے ساتھ دیا گیا ہے، بلکہ قرآن مجید کی مذکورہ استثناءات بھی صراحتاً ختم کر دی گئی ہیں۔ سِفر احبار میں یہ حکم یوں بیان کیا گیا ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا: بنی اسرائیل سے کہہ کہ تم لوگ نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا۔ جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو، ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ، پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے جسے لوگ آتشین قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں، وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔'' (۲۸)

ایک اور جگہ اس حکم کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت، ان سبھوں کو وہ الگ کرے اور کاہن مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشین قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے۔ ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمہاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔''(۲۹)

اس سے بخوبی معلوم ہوا کہ سورۃ النحل میں حلت وحرمت کے ضابطے کے بیان کے بعد یہ کیوں کہا گیا کہ اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ یہ گویا اصر اور اغلال کی ایک مثال ہوئی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے آئے۔ (سورۃ الاعراف، آیات ۱۵۶۔۱۵۷) مگر یہود نے اس نعمت کبریٰ کی قدر نہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے سے انکار کے لیے دلیل یہ پیش کی کہ وہ تورات کے حکم کو منسوخ کر رہے ہیں۔

حواشی

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: الفوز الکبیر فی علوم التفسیر، اردو ترجمہ مولانا رشید احمد انصاری، (مکتبہ برہان، اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۳ء)، ص ۳۸ تا ۴۳۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے: بدر الدین الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، (دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۸ء)، ج ۱، ص ۴۵۔۶۰۔

(۳) تفہیم القرآن، (ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۴ء)، ج ۲، ص ۴۶۸

(۴) تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۶۷۲

(۵) مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: سورۃ النور کے زمانۂ نزول پر ان کی تحقیق، تفہیم القرآن ج ۳، ص ۳۰۶۔۳۱۸۔

(۶) تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۵۲۰۔۵۲۳

(۷) تفہیم القرآن، ج ۶، ص ۴۱۰

(۸) ایضاً

(۹) تدبر قرآن، (فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۱ء)، ج ۱، ص ۲۴۔۲۷؛ ج ۸، ص ۴۷۹

(۱۰) البیان، دارالاشراق لاہور، ۲۰۰۱ء

(۱۱) روح المعانی، (داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵ء)، ج ۷، ص ۷۷

(۱۲) زادالمسیر، (مکتبۃ حقانیۃ، پشاور)، ج ۴، ص ۳۸۳

(۱۳) الجامع لاحکام القرآن، (مکتبۃ رشیدیۃ، کوئٹہ) ج ۱۰، ص ۱۹۷

(۱۴) تفسیر البیضاوی، (مکتبۃ مدنیۃ، لاہور) ج ۳، ص ۲۲۴

(۱۵) روح المعانی، ج ۱۴، ص ۲۵۷

(۱۶) جامع البیان، (دارالفکر، دمشق، ۱۹۷۸ء)، ج ۱۴، ص ۱۲۷

(۱۷) تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۷۹

(۱۸) بیان القرآن، (ادارۂ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ۱۴۲۷ھ)، ج ۱، ص ۵۸۷

(۱۹) ایضاً

(۲۰) روح المعانی، ج ۸، ص ۱۴

(۲۱) الجامع لاحکام القرآن، ج ۷، ص ۳۷

(۲۲) روح المعانی، ج ۸، ص ۱۴

(۲۳) آلوسی نے اس قول کا ذکر ضعیف صیغے قیل کے ساتھ کیا ہے۔ (ایضاً)

(۲۴) تدبر قرآن، ج ۴، ص ۴۶۰

(۲۵) ملاحظہ کیجئے یہودی ربی مائیکل ویشوگروڈ (Michael Wyschogrod) کا مقالہ زیر عنوان Islam and Christianity in the Perspective of Judaism (اسلام اور مسیحیت، یہودیت کے تناظر میں)۔
Al-Faruqi, Isma'il Raji, *Trialogue of the Abrahamic Faiths*, (Virginia: International Institute of Islamic Thought, 1991), pp 13-18

(۲۶) پیدائش: باب ۹، آیات ۳۔۵

(۲۷) سورۃ البقرۃ آیت ۶۷ میں گائے کے ذبح کے متعلق پہلا حکم ذکر ہوا ہے۔ اس میں بقرۃً لفظ آیا ہے جو اسم نکرہ ہے۔

(۲۸) احبار: باب ۷، آیات ۲۲۔۲۵

(۲۹) ایضاً: باب ۳، آیات ۱۵۔۱۷

ڈاکٹر محمود الحسن عارف☆

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے
تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے

[۱۴ر نومبر ۲۰۰۶ کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ''دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے'' کے عنوان پر ایک روزہ تربیتی ورکشاپ میں پڑھا گیا]

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی و دیگر معزز علماے کرام و شرکاے سیمینار!

میں سب سے پہلے تو آج کی تقریب کے میزبانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھ جیسے ایک طالب علم کو علما کی اس مجلس میں مدارس سے تعلق رکھنے والے ایک خصوصی مسئلے پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر زیادہ بہتر تھا کہ دینی مدارس کے کسی استاذ محترم کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی جو اس موضوع پر یقیناً مجھ سے بہتر آپ کی رہنمائی کرتے۔ غالباً میزبانوں کا خیال ہے کہ اس عنوان پر کسی غیر جانب دار مبصر کو اظہار خیال کے لیے کہا جائے، اس لیے ان کی نظر انتخاب مجھ جیسے شخص پر پڑی ہے۔ بایں ہمہ میں کوشش کروں گا کہ مجھے جو ذمہ داری تفویض ہوئی ہے، اس پر ایک غیر جانب دار مبصر کے طور پر روشنی ڈالوں۔

اس سے قبل کہ میں اپنے موضوع پر گفتگو کروں، مناسب خیال کرتا ہوں کہ میں ابتدا ہی میں اپنے اس تجربے کا تذکرہ کروں جو مجھے اپنی ابتدائی زندگی میں دینی مدارس کے ایک طالب علم کے طور پر حاصل ہوا۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے دینی تعلیم دینی مدارس کے ایک باقاعدہ طالب علم کے طور پر حاصل کی ہے۔ میری طالب علمی کا دور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء تک پھیلا ہوا ہے اور ان آٹھ برسوں میں، میں نے پانچ شہروں میں واقع چھ مدارس سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت وفاق المدارس کا موجودہ سیٹ اپ موجود نہ تھا اور طالب علم تعلیمی درجات اور مراحل کے انتخاب میں کافی حد تک آزاد ہوتا تھا اور آٹھ سال کا کورس چھ یا سات برسوں میں مکمل کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک سال تو فارسی پڑھی اور باقی سالوں میں مدرسہ کاشف العلوم شیخوپورہ، مدرسہ حسینیہ شہداد پور سندھ، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، دار العلوم کبیر والا اور جامعہ مدنیہ و جامعہ اشرفیہ لاہور میں درس نظامی کی تکمیل کی اور دورۂ حدیث میں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور مولانا محمد موسیٰ خان

☆ صدر شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

صاحبؒ جیسے اساتذہ کرام سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ اس وقت کے سالانہ امتحان میں مدارس میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی سعادت تک حاصل ہوتی رہی اور راقم الحروف کا شمار ہمیشہ اچھے طلبہ میں ہوتا رہا۔

اس تفصیل سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ آج کے اس سیمینار میں دینی مداس کی تعلیم کے حوالے سے جو کچھ عرض کیا جائے گا، وہ محض سنائی سنائی باتوں پر مبنی نہیں، بلکہ اس میں سے بہت کچھ ''آپ بیتی'' اور ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

دینی مدارس میں تربیتی نظام کی اہمیت وضرورت

جہاں تک آج کے موضوع کا تعلق ہے تو یہ میرے خیال میں بہت اہم بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی، اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تربیت نام کی شے ابھی تک دینی مدارس کی حدود میں داخل نہیں ہوئی۔ دینی مدارس میں تربیتی نظام نہ ہونے کی بنا پر انداز تدریس اور اسلوب تدریس میں عجیب بوالعجبیاں دیکھنے میں آتی ہیں اور دینی مدارس سے جو طلبہ فارغ ہوتے ہیں، دینی مدارس کے ذمہ دار حضرات انہی میں سے کسی ایک کا، ذاتی تعلق یا کسی سفارش کی بنیاد پر اپنے مدرسہ میں استاذ کی آسامی پر تقرر کر دیتے ہیں اور یہ دیکھنے اور جاننے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے کہ مذکورہ فرد میں پڑھانے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں، اور چونکہ مدارس سے طالب علموں کی جو کھیپ تیار ہو رہی ہے، وہ زیادہ تر ایسے ہی اساتذہ کے ''فیضان علمی'' کا نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ دن بدن طالب علموں کا علمی اور فکری معیار گرتا جا رہا ہے اور درس نظامی سے فراغت حاصل کرنے والے طلبہ کی اکثریت کسی بھی عربی کتاب کو سمجھنا تو درکنار، اس کی عبارت تک پڑھنے سے ناواقف رہتی ہے اور مقابلے کے امتحانات میں معلومات کے فقدان اور نصاب پر گرفت نہ ہونے کی بنا پر اکثر ناکام رہتی ہیں اور اکثر وبیشتر نشانہ تضحیک بنتی ہے۔

دینی تعلیم وتربیت کا پس منظر

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دینی تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تسلسل کے ساتھ کابراً عن کابر چلا آ رہا ہے اور اس میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی انقطاع واقع نہیں ہوا اور اس میں مسلمانوں کی محنت سے زیادہ قرآن حکیم اور اس کے سایے تلے نشوونما پانے والے علوم وفنون کے اعجازی پہلو کا زیادہ تعلق ہے، اس لیے یقیناً وہ لوگ خوش قسمت اور خوش نصیب ہیں جنہیں ان علوم وفنون کو پڑھنے اور پڑھانے کا موقع ملتا رہا اور جن کے سینے ''یاد یار مہرباں'' سے اور ہونٹ ''ذکر یار'' سے معطر اور منور رہے ہیں اور انہوں نے دشمنوں کی ہزاروں کوششوں اور ہزار کاوشوں کے باوجود اس تعلیم کا پرچم سربلند رکھا۔ اللہ تعالیٰ علوم اسلامیہ کے ان جاں بازوں پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

تاہم دینی مدارس کے موجودہ نصاب اور موجودہ نظام تعلیم کا تعلق متاخر مغلیہ دور سے تعلق رکھنے والی ایک قد آور اور بالغ نظر ہستی ملا نظام الدین سہالویؒ (۱۰۸۸۔۱۰۸۹ھ مطابق ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی ذات سے ہے جنہوں نے ایک ایسا جامع اور عمدہ نصاب تعلیم متعارف کروایا جو صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی اسی آب وتاب اور اسی جوش وخروش اور دینی جذبے سے پڑھایا جا رہا ہے۔ اسے دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک نے نئے ''بال وپر'' عطا کیے جو انگریز کے مکمل تسلط، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور ۱۹۳۵ء میں لارڈ میکالے کی طرف سے آنے والی تعلیمی پالیسی کے عملی نفاذ کے بعد

سامنے آئی۔ ملا نظام الدین سہالویؒ کا تیار کردہ نصاب تعلیم کا اگر دار العلوم دیوبند کی علمی اور فکری تحریک کے ذریعے احیا اور اجرا نہ ہوا ہوتا تو شاید یہ نصاب تعلیم ہندوستان کے دوسرے کئی نصاب ہائے تعلیم کی طرح کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ یقیناً اسے دوسری زندگی دار العلوم دیوبند کی علمی تحریک نے عطا کی ہے۔

نصاب تعلیم کی طرح انداز تدریس بھی صدیوں کی روایت اور قدامت رکھتا ہے اور آج بھی درس نظامی کی کتب کو پڑھانے کا طریقہ اور انداز وہی ہے جو صدیوں پہلے ہندوستان بھر میں خصوصاً اور باقی دنیائے اسلام میں عموماً رائج اور نافذ تھا۔ ابتدائی دور میں چونکہ پڑھانے والے اساتذہ تدریس میں خصوصی مہارت رکھتے تھے اور پڑھنے والے بھی محض ذاتی شوق اور محنت سے پڑھایا کرتے تھے، اس لیے اس وقت اساتذہ کی تربیت نہ ہونے کے باوجود بہت عمدہ طریقے سے کام چل رہا تھا۔ اس وقت استاد اور شاگرد کے مابین تعلق کا جو لازوال رشتہ قائم ہوتا تھا، وہ انہیں ایک دوسرے کے قریب کرتا تھا اور چونکہ طلبہ اپنے اساتذہ کے ساتھ جو وقت گزارتے تھے، اس کے دوران وہ اپنے اساتذہ سے سیکھنے کا عمل جاری رکھتے تھے، اس لیے جب وہ مسند تدریس پر فائز ہوتے تو انہیں کوئی دقت اور دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

دوسرا اہم اور امتیازی فرق یہ تھا کہ اس دور میں علوم آلیہ (صرف ونحو اور منطق) پر شروع میں خوب محنت کرائی جاتی تھی جس کی بنا پر طالب علم کی عربی عبارت اور گرامر پر گرفت مضبوط ہو جاتی تھی۔ اس کے لیے اپنے استاد سے سیکھنے کا عمل بہت بہتر ہوتا تھا۔ مگر اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے اور طالب علم اور استاد میں فاصلے بڑھ گئے ہیں اور اساتذہ کے دروس محض حاشیوں اور شروح تک محدود ہو گئے ہیں۔ جس استاد محترم سے میں نے کافیہ پڑھا، انہوں نے سات دن اس کے پہلے جملے 'الکلمة لفظ وضع لمعنی مفردٌ مفرداً مفردٍ' کی تشریح پر لگائے جس کے دوران انہوں نے کافیہ کی ایک شرح کی پوری باتیں اپنے طالب علموں کے گوش گزار کیں، لیکن ان سات دنوں کی اس تقریر میں شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو اس وقت کے میرے طالب علمانہ ذہن میں بیٹھی ہو۔ اس طرح مختلف کتابوں کے اساتذہ کرام کی کاپیاں کافی مشہور تھیں۔ میرے ایک استاد محترم نے اس وقت (۱۹۷۳ء میں) ہمیں حدیث کی ایک کتاب کے جو نوٹس لکھوائے تھے، برسہا برس گزرنے کے باوجود نہ تو ان کے ان نوٹس کے الفاظ بدلے ہیں اور نہ ہی ان کے معانی ومضامین میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

یہ میرے اساتذہ کرام کی محنت کا ثمر تھا کہ حدیث کی تعلیم کے دوران بھی ہم پر حدیث کا کوئی رنگ نہیں چڑھا اور ہم بخاری، مسلم اور ترمذی کے درسوں میں بھی قدوری، ہدایہ اور نور الانوار کا مزہ لیتے رہے اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ چند ایک اساتذہ کرام کے سوا کسی ایک استاد نے کتاب کے مصنف کا یا ان کے حالات کا ذکر کیا ہو اور یہ بتایا ہو کہ یہ کتاب کس دور میں لکھی یا تصنیف کی گئی۔ بعض اساتذہ گھنٹہ بھر کی تدریس کے بعد جب درس گاہ سے رخصت ہوتے تو ہمارا ذہن کورے کاغذ کی طرح خالی اور صاف ہوتا اور ہمیں ان کی لچھے دار تقریروں میں سوائے دو چار جملوں کے کچھ بھی یاد نہ رہتا تھا۔ پھر علامہ تفتازانی اور جرجانی کے حاشیہ در حاشیوں کا مسئلہ اس پر مستزاد ہے جن کی اٹھائی ہوئی منطقی موشگافیوں سے ذہن تو یقیناً تیز ہوتا ہے، مگر طالب علم کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور مجبوراً امتحان کے وقت دوسرے لوگوں کی تیار کردہ کاپیوں یا نوٹس کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب سے وفاق المدارس کا نظام قائم ہوا ہے، اس وقت سے تو یہ کاپیاں اور یہ نوٹس ایک بین الملکی شے بن گئے ہیں اور طالب علموں کے لیے Guess paper کا سا درجہ رکھتے ہیں۔

دراصل ہر مضمون کو اس کے اپنے ماحول میں مطالعہ کرنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگر دینیات کو منطق کے رنگ

میں یا حدیث کو فقہ کے انداز میں پڑھایا جائے تو اس سے اس مضمون کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے ان رویوں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ حالات اور ہمارے دینی مدارس سے تیار ہونے والی علما کی کھیپ اور ان کا معیارِ علمی اور معیارِ تعلیمی، دینی مدارس کے زعما کے لیے بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے جس کی بنا پر مذہب کی دنیا میں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی ہیں اور ہمیں شاید ابھی تک اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ یہ محض تصویر کا وہ رخ ہے جو شاید ہمارے سامنے نہیں ہے یا جس کی طرف سے ہم نے اپنی آنکھیں عملاً بند کر رکھی ہیں اور ہم کسی بھلے وقت کا انتظار کر رہے ہیں جو شاید کبھی نہیں آئے گا اور ہمیں وہی کچھ ملے گا جو ہم اپنی ان نسلوں کے ذہنوں میں بو رہے ہیں۔

پس چہ باید کرد

اب سوال یہ ہے کہ دینی مدارس کے معیارِ تعلیم، وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں کی بالغ نظری اور انہیں وقت اور زمانے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنا سکھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس حوالے سے اب یہ بات ناگزیر ہو گئی ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی مناسب و موزوں تربیت کا بھی انتظام اور اہتمام ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں یہ بات عملاً تسلیم کر لی گئی ہے کہ دوسروں کو پڑھانا یا تعلیم دینا یہ ایک الگ اور مستقل فن ہے اور یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ایک اچھا عالم ایک اچھا استاد بھی ہو اور یہ فن بھی تعلیم و تعلم کا محتاج ہے۔ خود لفظ تعلیم میں اس عملی پہلو کی طرف رہنمائی پائی جاتی ہے۔ نامور ماہر لغات علامہ راغب الاصفہانی نے لفظ تعلیم کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

والتعليم اختص بما يكون بتكرير وتكثير حتى يحصل منه اثر فى نفس المتعلم وقال بعضهم التعليم تنبيه النفس لتصور ذالك

(الراغب الاصفہانی، مفردات فی غریب القرآن، ص ۳، بذیل مادہ علم)

''تعلیم کسی شے کو دہرانے اور کثرت کے ساتھ اس کے تکرار کا نام ہے، تا آنکہ اس کا اثر طالب علم کے نفس پر ظاہر ہو جائے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ تعلیم اس کے تصور کے لیے نفس کو متنبہ اور آگاہ کرنے کا نام ہے۔''

تعلیم کی اس لغوی تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ تعلیم بذات خود ایک الگ اور مستقل فن ہے جو سیکھنے سکھانے کا محتاج ہے۔ جبکہ تربیت کا مادہ ''رب'' ہے جو کہ مصدر ہے۔ علامہ راغب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

الرب فى الاصل التربية هو انشاء الشئ حالا فحالا الى التمام يقال ربه ورباه وربيه فالرب مصدر مستعار للفاعل (ایضاً، ص ۱۸۹، بذیل مادہ رب)

''الرب کے لغوی معنی ''تربیت'' کے ہیں، یعنی کسی شے کو درجہ بدرجہ کمال تک پہنچانا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: 'ربہ ورباہ وربیہ'۔ اس طرح 'الرب' لغوی لحاظ سے مصدر ہے جو فاعل (تربیت کرنے والے) کے مفہوم میں مستعار لیا گیا ہے۔''

اور اگر جدید علم التعلیم کے حوالے سے بات کی جائے تو فن تعلیم یا فن تدریس سے مراد نصاب کو موثر انداز میں طلبہ تک پہنچانے کے لیے موثر حکمت عملی کو اپنانے کا نام ہے۔ اس کے لیے اصول نفسیات اور طرق تدریس کا صحیح فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ نظام تعلیم کا یہ پہلو اطلاقی و عملی حیثیت رکھتا ہے۔

مزید برآں آج کل تعلیم وتدریس کو کسی ایک طریقے تک محدود نہیں سمجھا جاتا، بلکہ دور حاضر میں تعلیم اور تدریس کے بیسیوں طریقے ہیں جو طالب علم اور طالب علموں کے رویے اور ان کی ذہنی سطح اور ان کے فکری افق کو سامنے رکھ کر اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے خود استاد یا معلم کی تربیت کا ہونا ضروری ہے۔ پھر جس طرح علم کی تحصیل، محنت کے علاوہ اساتذہ کی طرف سے مناسب رہنمائی کی محتاج ہے، اس طرح ''تربیت معلم'' کے لیے طالب علم میں مناسب وموزوں اہلیت کا ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی طرف سے مناسب رہنمائی کا ملنا بھی ضروری ہے۔

اب آیئے، ہم دیکھیں کہ دینی مدارس کے اساتذہ کی کن کن پہلوؤں پر رہنمائی یا تربیت ضروری ہے۔

۱۔ مقاصد

دنیا میں جس طرح علوم وفنون میں تنوع اور رنگا رنگی ہے، اسی طرح تدریسی مناہج اور تعلیمی طریقوں میں بھی بڑا تنوع پایا جاتا ہے اور مقاصد تعلیم کو سامنے رکھ کر تعلیم کا منہج اور تدریس کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر مختلف قومیں اور مختلف ممالک اپنی تعلیمی پالیسیاں جاری کرتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں تعلیمی مقاصد پر کوئی توجہ اور کوئی دھیان نہیں دیا جا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس میں تعلیم کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے اور یہ مقصد بذات خود بڑا مقصد ہے، لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ضمنی اور جزوی مقاصد کا تعین بہر حال ضروری ہے۔

تعلیمی مقاصد کا تعین اور ان کے مطابق تعلیمی انداز اور منہج کا اختیار کرنا اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اب دنیا کا ماحول بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور ایک استاد کو اس بات کا احساس اور ادراک ہونا ضروری ہے کہ اسے کس ماحول میں اور کس انداز سے اپنی بات کہنی ہے۔

۲۔ تعلیم کے جدید طریقے

پھر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہمارے دینی مدارس میں زیادہ تر، تدریس کا ایک ہی طریقہ رائج اور نافذ ہے جسے درسی کتب کا طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ اس طریقے میں استاد خود درسی کتاب سے کچھ حصہ پڑھتا ہے یا کسی طالب علم سے پڑھواتا ہے اور پھر استاد عبارت کے مشکل مقامات کی تشریح کرتا جاتا ہے اور حسب ضرورت طلبہ سوالات کے ذریعے بھی اپنی مشکلات حل کرتے ہیں۔ تعلیم اور تدریس کا یہ طریقہ اتنا فرسودہ ہو چکا ہے کہ اس سے نہ تو طالب علم میں کوئی علمی مہارت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی استاد کی علمی اور فکری صلاحیتوں میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس انداز تعلیم سے کلاس کے صرف ذہین طلبہ ہی مستفید ہو سکتے ہیں اور ایسے طلبہ جن کا ذہنی اور فکری مستوی مختلف ہو، یہ طریقہ تدریس ان کے لیے چنداں فائدہ مند نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عصر حاضر میں تعلیم ایک ''فن'' اور ایک ''سائنس'' بن گیا ہے اور طالب علموں کو مضمون پڑھانے کے لیے بیسیوں طریقے ایجاد کیے جا چکے ہیں جن میں سمعی اور بصری ذرائع اور وسائل کو اختیار کر کے طالب علموں کے لیے حصول علم میں آسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہر مضمون اور ہر ایک (Subject) کو پڑھانے کا مستقل طریقہ یا طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں، اور جو مضمون جتنا اہم ہوتا ہے، اتنا ہی اسے آسان اور سہل طریقے سے پڑھانے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے عربی صرف ونحو، حدیث، فقہ اور قرآن مجید کی تدریس کے آسان اور سہل طریقے اختیار کرنا وقت کی سب سے اہم اور سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ طریقہ ہائے تدریس میں وسعت اور

تنوع سب سے پہلے مسلمان علما کے ہاں پیدا ہوا جس کے لیے صحیح بخاری کی کتاب العلم کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں مسلمانوں کے ہاں اس بارے میں پائی جانے والی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۔ طلبہ میں نظم ونسق کا مسئلہ

اس سلسلے میں سب سے خراب صورت حال طلبہ کے ساتھ معاملات کی ہے۔ دینی مدارس میں طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا رویہ اور ان کا معاملہ بے حد افسوس ناک حیثیت رکھتا ہے۔ عام طور پر دینی مدارس میں طلبہ کی وہی حیثیت ہے جو جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاں ان کے مزارعوں اور نوکروں کی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ دینی مدارس میں طلبہ کے کوئی آئینی حقوق نہیں ہیں۔ اسباق کے دوران طلبہ کو زیادہ سوالات پوچھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے قدوری کے سبق میں اپنے استاد سے یہ پوچھا تھا کہ اگر نماز کے دوران میں نمازی کو ایک سے زیادہ مرتبہ سہو ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو میرے استاد محترم نے جواب دیا تھا کہ ''تم مودودی کی طرح خواہ مخواہ کے سوال نہ اٹھایا کرو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اس کا مزید جواب دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بعض اساتذہ سوال پوچھنے پر اپنی درس گاہ سے طالب علم کو نکال دیتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں دینی مدارس میں طلبہ کی ذہنی استعداد بڑھانے اور اس بارے میں ان کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان کے اندر موجود علمی اور فکری صلاحیتوں کو کچلنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں مدارس میں طالب علموں کا گلا گھونٹنے کا قدم قدم پر بندوبست ہوتا ہے تاکہ ان کے اندر سے ''لا الہ الا اللہ'' کی کوئی آواز بلند نہ ہو سکے۔ یہ طالب علم انتہائی خوف کے عالم میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مدارس کی انتظامیہ ہر ممکن طریقے سے طالب علموں کی تذلیل گوارا اور روا رکھتی ہے۔ سب سے زیادہ دکھ ذہنی اور فکری تذلیل کا ہے جس کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ ان رویوں اور طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے زیادہ تر طلبہ کا تعلق پس ماندہ علاقوں اور پس ماندہ خاندانوں سے ہوتا ہے، اس لیے وہ اس گھٹے ہوئے اور تذلیل وتحقیر کے ماحول کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں، لیکن ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا یہ رویہ ان کے اندر موجود ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے خاتمے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ احیا واشاعت دین کا کام کریں گے، احمقانہ سی بات ہے۔ موجودہ زمانے میں طلبہ سے ڈیلنگ بھی ایک مستقل فن اور ایک مستقل علم بن چکا ہے اور اس کے لیے بھی اساتذہ کی بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔

مختصراً یہ کہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اساتذہ کی تربیت کا کوئی معقول نظام اپنایا جائے۔ یہ کام وفاق المدارس کی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے اور مختلف مدارس کی سطح پر بھی۔ جن مضامین اور موضوعات میں انہیں تربیت کی ضرورت ہے اور جن جن طریقوں سے انہیں تربیت مہیا کی جا سکتی ہے، ان کا تعین باہم مشاورت سے کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ کے لیے ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ دینی مدارس میں بطور استاد ہونے والی نئی بھرتی میں انہی تربیت یافتہ اساتذہ کو موقع دیا جائے۔ اس سے دینی مدارس کی تعلیم میں بہتری آئے گی اور طالب علم کے ذہنی افق میں اضافہ ہوگا۔

آرا وافکار

مولانا محمد بشیر سیالکوٹی ☆

ہماری درس گاہوں میں عربی زبان وادب کی پس ماندگی

میں آج کی نشست میں وطن عزیز کی سرکاری اور غیر سرکاری درسگاہوں میں، جن میں ہمارے قابل قدر دینی مدارس یا عربی مدارس سرفہرست ہیں، عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کی پسماندگی اور اس کے اسباب اور اس سے پیدا ہونے والے متنوع نتائج پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

تدریس عربی میں پس ماندگی سے کیا مراد ہے؟

اولاً میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ خصوصا ہماری دینی درسگاہوں میں عربی زبان وادب کی نہایت وقیع اور معیاری کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، نیز عربی گرامر کے دونوں شعبوں یعنی علم صرف اور علم نحو میں مستند اور مفصل کتابوں کی تدریس ہوتی ہے اور ان کی تعلیم وتدریس کئی سال جاری رہتی ہے، جو بڑی محنت اور جانفشانی سے کی جاتی ہے۔ اور پھر ان تینوں علوم (عربی زبان، علم صرف اور علم نحو) کی تدریس کی ذمہ داری صرف کہنہ مشق اور محنتی اساتذہ کو ہی دی جاتی ہے۔ چنانچہ طلبہ وطالبات علم صرف کی گردانوں اور قواعد کو بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں بلکہ حفظ کرتے اور فرفر سناتے ہیں اور نحو کے قواعد کو بھی نہایت محنت اور توجہ سے پڑھایا جاتا ہے، پھر بڑی جماعتوں میں عربی زبان کی بلاغت اور معانی کی مستند کتابوں کی تدریس بھی ہوتی ہے۔ تو ان علوم پر اتنی توجہ اور اہتمام کے باوجود ہمارے طلبہ وطالبات ان میں پسماندہ کیوں رہتے ہیں؟ اور اس پسماندگی کا کیا مفہوم ہے؟

اسلامی درسگاہوں کی ان مفید خدمات اور روشن پہلوؤں کے باوجود ہم ان کے فضلا کو دیکھتے ہیں کہ وہ عربی زبان اور عربی ادب دونوں میں پس ماندہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان علوم کی پچیس تیس کتابیں پڑھنے کے باوجود عربی زبان کے عملی استعمال یعنی اس میں گفتگو اور تحریر کی قدرت نہیں رکھتے اور سخت ضرورت کے وقت معمولی عربی بول چال اور تحریر سے بے بس نظر آتے ہیں، نیز اہل زبان سے ملاقات کے وقت ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے، اور عصر حاضر کے عربی اخبارات اور مجلّات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ وہ صرف قدیم کتابوں کی عبارتوں کو سمجھتے ہیں لیکن جدید عربی لٹریچر کا مطالعہ نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے طویل تعلیمی عرصے میں ان کی کتابوں کا اردو ترجمہ یاد کرتے ہیں، اور ان کے قواعد اور اصولوں کو صرف نظری اور زبانی حد تک رٹنے میں صرف کرتے ہیں اور عربی الفاظ اور تراکیب کے ان روزمرہ استعمالات اور

☆ پرنسپل معہد اللغۃ العربیۃ، اسلام آباد

محاوروں سے ناواقف رہتے ہیں جو اہل زبان کے معاشرے میں لکھے بولے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ فاضل حضرات صرف عربی زبان کے مفرد اسماء اور افعال کو کسی حد تک جانتے ہیں اور ان کے عملی استعمال کی شکلوں اور تراکیب سے ناواقف رہتے ہیں۔

اس لیے مدارس کے طلبہ اور اساتذہ اولاً تو عربی بولنے یا لکھنے سے بچتے ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ اسے بولنے یا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے جملوں میں لغت، صرف، نحو اور محاوروں کی غلطیاں اتنی کثرت سے ہوتی ہیں کہ ان کی اصلاح کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہوں نے اگرچہ زبان کے ان چاروں اجزا کو سالہا سال تک پڑھا بلکہ رٹا ہوتا ہے لیکن انہیں ان کے عملی استعمال کی مشق اور تربیت سے محروم رکھا گیا ہے، لہٰذا اسے لکھنے یا بولنے کی استعداد حاصل نہیں کر سکے، حالانکہ ان کیلئے عربی ایک نہایت آسان زبان ہے۔ اگر انہیں کچھ ہی عملی تربیت کرا دی جاتی تو وہ اسے خوب لکھ بول سکتے۔

اب میں محترم علمائے کرام، تعلیمی ماہرین، عربی زبان وادب کے معلمین اور معلمات نیز اپنے عزیز طلبہ وطالبات کے سامنے اس مسئلے کو آسانی سے پیش کرنے کے لئے عربی زبان کی تعلیم وتدریس کی چند مثالیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا طریقہ تدریس

یہ ہمارے فاضل دوست جامعہ ..... میں عربی زبان کے مدرس ہیں۔ اس وقت ان کے سامنے اٹھارہ بیس طلبہ بیٹھے ہیں۔ وہ انہیں وفاق المدارس العربیۃ کے نصاب میں مقرر نصابی کتاب قصص النبیین، الجزء الاول پڑھا رہے ہیں جو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ معلم اور طلبہ کے ہاتھوں میں کتاب کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ ان کی تدریس کا طریقہ یہ ہے کہ معلم خود سبق کی عبارت پڑھ رہا ہے اور طلبہ کو اس کے الفاظ اور جملوں کا لفظی اردو ترجمہ بتا رہا ہے جسے وہ سنتے ہیں اور ذہن نشیں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ طلبہ اپنے معلم سے سبق کی عبارت کا لفظی اردو ترجمہ پڑھتے اور اسے یاد کرتے ہیں۔ معلم کے پاس اپنی تیاری کیلئے اس کتاب کا چھپا ہوا اردو ترجمہ موجود ہے جسے وہ حسب ضرورت دیکھ لیتے ہیں۔

نتیجہ: طلبہ سبق کی عبارت کا لفظی اردو ترجمہ سمجھنے اور یاد کرنے لگتے ہیں۔

دوسرا طریقہ تدریس

یہ ہمارے ایک فاضل دوست موقر دار العلوم ..... میں عربی زبان وادب کے مدرس ہیں۔ یہ ابتدائی اور متوسط جماعتوں کو پڑھانے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ بھی اس پیریڈ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب قصص النبیین، الجزء الاول کی تدریس کر رہے ہیں۔ تاہم ان کی تدریس کا طریقہ پہلے مدرس کے طریقہ تدریس سے کچھ مختلف ہے۔ ان کی جماعت میں تختہ سیاہ موجود ہے اور ہر طالب علم کے پاس نصابی کتاب کے علاوہ اپنی کاپی اور قلم موجود ہے۔ معلم سبق کے آغاز میں تختہ سیاہ پر مناسب اور خوبصورت خط میں سبق کے منتخب الفاظ کی تشریح لکھ رہا ہے جس میں عربی افعال کے معنی اور ان کا ماضی، مضارع اور مصدر، نیز اسم مفرد کا معنی اور جمع، اور جمع اسم کا معنی اور مفرد وغیرہ۔ طلبہ الفاظ کی اس تشریح کو اپنی کاپیوں میں نقل کر کے اسے یاد کر رہے ہیں۔ بعد ازاں معلم سبق کی تدریس اس طریقے پر کرتا ہے کہ ایک

طالب علم سبق کی عبارت پڑھتا ہے اور معلم اس کا اردو ترجمہ کرتا جاتا ہے۔ یوں پہلے سبق کی تکمیل ہوتی ہے اور طلبہ سبق کی عبارت کے اردو معنی کو آسانی سے سمجھنے لگتے ہیں اور مختلف عربی الفاظ کی تشریح سے واقف ہوتے ہیں۔

نتیجہ: طلبہ سبق کی عبارت کے اردو ترجمہ اور الفاظ کی تشریح کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

تیسرا طریقہ تدریس

یہ تیسرے معلم معہد اللغۃ العربیۃ اسلام آباد میں اپنے طلبہ کو یہی کتاب قصص النبیین، الجزء الاول پڑھا رہے ہیں۔ بچوں کے سامنے ایک وائٹ بورڈ آویزاں ہے اور ہر بچے کے پاس نصابی کتاب کے علاوہ ایک کاپی اور قلم موجود ہے۔ نیز معلم اور ہر طالب علم کے پاس اس کتاب کی تدریسی گائیڈ (ورک بک) موسومہ دلیل قصص النبیین، الجزء الاول موجود ہے۔ وہ اس گائیڈ کے مطابق سبق کے آغاز میں وائٹ بورڈ پر سبز مارکر سے منتخب الفاظ کے معنی اور تشریح لکھتے ہیں، جسے ہر طالب علم بلند آواز سے پڑھتا ہے، اور اس کے صحیح تلفظ کی مشق کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اسے اپنی کاپی میں درج کرتا ہے۔ اس کے بعد معلم عربی میں کہتے ہیں: الآن بدأ الدرس، الآن نبدأ الدرس۔ اور سبق کی تدریس شروع ہوتی ہے، تو سبق کو معلم خود نہیں پڑھتا بلکہ اسے باری باری مختلف طلبہ پڑھتے ہیں اور معلم اس کا بامحاورہ اردو ترجمہ بولتا ہے۔ پھر معلم گاہے گاہے طلبہ کو مناسب ہدایات دیتے ہوئے عربی بولتا ہے۔ مثلاً الآن اقرأ أنت یاخالد، الآن اقرأ أنت یا حمزۃ، اور کسی طالب علم کے اچھے نطق پر أحسنت! بارك الله فيك اور کسی سے غلطی سرزد ہونے پر لا، یا عبد الرحمن اور سبق کے اختتام پر الآن انتهى الدرس، الآن انتهت الحصة وغیرہ۔ نیز معلم طلبہ کو جملوں کے لفظی ترجمہ سکھانے کے بجائے ان کا بامحاورہ ترجمہ بتاتا ہے۔ اس طرح معلم پہلے پیریڈ میں پہلے سبق کی تدریس مکمل کرتا ہے۔

پھر دوسرے دن وہ طلبہ کو دلیل قصص النبیین، الجزء الاول کے مطابق اس سبق پر عربی میں بول چال کی مشق کراتا ہے، جو دو مشقوں پر مشتمل ہے۔ پہلی مشق میں سبق کے مضمون کے بارے میں عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے سوال دیئے گئے ہیں۔ معلم ایک سوال بولتا ہے، تو طلبہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ اگر طلبہ کا جواب غلط یا ناقص ہو تو معلم اسے درست کراتا ہے۔ دوسری مشق میں سبق کے بارے میں لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پر کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

عربی بول چال کی ان دونوں مشقوں کو طلبہ دو بار زبانی اور تحریری دونوں طرح حل کرتے ہیں؛ پہلے کلاس میں اپنے معلم کی نگرانی میں زبانی حل کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنی کاپیوں میں تحریری طور پر حل کر کے لاتے ہیں اور معلم اسے چیک کرتا اور حسب ضرورت تصحیح کر کے اس پر اپنے دستخط کرتا ہے۔

نتیجہ: طلبہ سبق کی عبارت کا بامحاورہ اردو ترجمہ سیکھتے ہیں اور مختلف عربی الفاظ کی لغوی تشریح کے ساتھ ان کے تلفظ کی صحت سیکھتے ہوئے روزمرہ کی ابتدائی عربی زبان کو سمجھنے، لکھنے اور بولنے لگتے ہیں کیونکہ انہیں عربی لکھنے اور بولنے کا اچھا ماحول میسر آیا ہے۔

چوتھا طریقہ تدریس

یہ معہد اللغۃ العربیۃ میں عربی زبان وادب کے ایک دوسرے معلم ہیں۔ آیئے ان کی کلاس کو دیکھتے ہیں۔ یہ آج راقم الحروف کی کتاب اقرأ، الجزء الاول کا پہلا سبق پڑھا رہے ہیں۔ اس سبق میں چونکہ ہر چیز کی تصویر کے ساتھ اس کا عربی نام لکھا ہے، اسلئے وہ الفاظ کا اردو ترجمہ نہیں کرتے، بلکہ ہر چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا عربی نام پڑھنے کی مشق کراتے ہیں اور اگر طالب علم سے کسی اسم کی خواندگی میں تلفظ کی غلطی واقع ہو تو اسے درست کراتے ہیں۔ کلاس کے شرکاء بالکل نئے ہیں اور آج پہلے دن عربی زبان پڑھنے لگے ہیں اس کے باوجود وہ انہیں براہ راست عربی پڑھنے اور بولنے کی مشق کرا رہے ہیں۔ وہ تمام طلبہ کو ضروری ہدایات بھی عربی میں ہی دے رہے ہیں، اور جہاں دقت پیش آتی ہے، اشارے سے کام لیتے ہیں۔ اب کلاس پہلا سبق ختم کر رہی ہے تو معلم نے انہیں کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ما ھذا؟ سے سوال کرنا سکھا دیا ہے اور اس کا جواب بھی ھذا قلم وغیرہ سمجھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم اضافی مشق یعنی کسی شخص کے بارے میں سوال کرتے ہوئے من ھذا؟ اور اس کا جواب بھی سکھا دیا ہے، اور اس کے لیے جماعت کے شرکا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے من ھذا؟ ھذا أکرم، من ھذا؟ ھذا جمیل الرحمن وغیرہ کی مشق کرا دی ہے۔ اور اس نہج کو جاری رکھتے ہوئے سبق کی تینوں مشقیں بھی حل کرا دی ہیں۔

یوں ان نو وارد طلبہ نے آج اٹھارہ بیس چیزوں کے عربی نام سیکھ لئے ہیں اور ان کے بارے میں سوال وجواب کی مشق کر لی ہے، اور اس طرح پندرہ بیس اشخاص کے بارے میں من ھذا؟ کی مشق بھی کر لی ہے اور مجموعی طور پر پہلے ہی دن ھذا .....، ھذا ..... کی طرح کے تیس سے زیادہ عربی جملے فر فر بولنے لگے ہیں۔ اب معلم نے طلبہ کو ہدایت دی ہے کہ وہ کل ان مشقوں کو اپنی کاپیوں میں تحریر کر کے لائیں۔

نتیجہ: طلبہ سبق کے جملوں کو براہ راست سمجھنے کے علاوہ انہیں بار بار پڑھنے بولنے اور لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ان کے تلفظ کی تصحیح بھی کر چکے ہیں۔ کیونکہ انہیں خالص عربی ماحول میں بول چال کی مشق کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔

ہمارے ہاں مروجہ طریقہ تدریس

اب آیئے دیکھیں کہ ہم اپنی درسگاہوں میں اپنے بچوں کو بنیادی عربی زبان کی تعلیم ان چار طریقوں میں کس طریقے پر دے رہے ہیں؟ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہماری درسگاہوں میں عرصہ دراز سے عربی زبان وادب کی تعلیم کا پہلا طریقہ تدریس ہی رائج ہے اور ہمارے اساتذہ سبق کے لفظوں یا عبارت کو خود پڑھتے ہیں یا کبھی کبھی کسی طالب علم سے پڑھوا کر اس کا اپنی مقامی زبان اردو وغیرہ میں ترجمہ کرتے ہیں، جسے طلبہ وطالبات سنتے اور یاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری اکثر درسگاہوں میں تفہیم وتعلیم کا بنیادی ذریعہ تختہ سیاہ یا وائٹ بورڈ موجود نہیں ہوتا، اگر موجود ہوتا ہے تو اسے بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے بچوں کو عربی الفاظ کی تشریح لکھوانے کا اہتمام بہت ہی کم کیا جاتا ہے۔ یوں ہمارے مروجہ نظام تعلیم میں عربی زبان وادب، قرآن کریم اور حدیث شریف نیز صرف ونحو اور فقہ کی تدریس کا یہی منہج جاری ہے کہ سال اول سے لیکر سال ہشتم (دورہ شہادۃ عالمیۃ) تک اور مڈل سے لے کر ایم اے عربی، ایم اے اسلامیات تک، بلکہ پی ایچ ڈی تک عربی

عبارتوں کا اردو ترجمہ ہی سکھاتے ہیں، اور ان کا اردو ترجمہ کر لینے اور اپنی زبان میں ان کے مفہوم کی تشریح کرنے کو کامیابی کی منزل قرار دیتے ہیں۔ اس کے سوا وہ اس پورے عرصے میں عربی زبان کے الفاظ اور محاوروں کو لکھنے یا بولنے اور ان کے متنوع استعمالات کی کوئی مشق نہیں کرتے، اور نہ ہی انہیں عربی زبان میں زبانی یا تحریری بول چال کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ مثلاً ملک کے عربی مدارس کے تمام وفاقوں کے نصاب تعلیم کو دیکھ لیجیے، اس میں ایسی درسی کتابیں بہت کم ملیں گی جن میں متعلقہ مضمون پر سوال و جواب، عربی بول چال اور تحریر و انشاء کی مشقیں موجود ہوں، اور جہاں ایسی بہت ہی کم کتابوں میں ایسی مشقیں موجود ہوتی ہیں ان کی تدریس کرنے والے اساتذہ انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ انہیں زبانی یا تحریری طور پر حل کرانے کا اہتمام نہیں کرتے الا قلیل منھم۔

ہمارے نظام تعلیم میں عربی زبان عملاً متروک ہے

اگر آپ اپنے ملک کے قرآن وحدیث اور عربی ادب کو پڑھنے والے نہایت ذہین اور محنتی طلبہ بلکہ نہایت وسیع اور طویل تدریسی تجربات کے مالک اساتذہ کرام کو دیکھتے ہیں کہ وہ بوقت ضرورت عربی زبان میں گفتگو اور تحریر میں بے بس ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عربی زبان اس قدر مشکل یا پیچیدہ ہے کہ اسے طویل عرصہ تک پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود اس میں مناسب صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ انہیں ان کی طویل تعلیمی مدت کے دوران ایسی تربیت نہیں دی گئی۔ بلکہ انہیں عربی زبان اور ادب کے زبانی اور تحریری استعمال سے مکمل محروم رکھا گیا۔ اس لئے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں عربی زبان کو، غیر شعوری طور پر ہی سہی، عملی طور پر اور مسلسل ترک کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمارے فضلا اس فن میں ترقی نہیں کر سکتے۔

ہماری درسگاہوں میں عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے دوران کئی صورتوں میں اس کے عملی استعمال کی راہ نکل سکتی ہے لیکن ہم ایسا نہیں کر سکے۔ چنانچہ عربی کو ترک کرنے اور نظر انداز کرنے کی کئی صورتیں بالکل واضح ہیں:

۱- ہماری نصابی کتابوں میں تمرین وتربیت کی مشقیں موجود نہیں ہیں۔

۲- ہمارے اساتذہ بول چال اور تحریر کی مشقیں نہیں کراتے۔

۳- ہمارے اداروں میں تشریح وتعلیم کیلئے تختہ سیاہ استعمال نہیں کیا جاتا۔

۴- ہمارے اداروں کے داخلی ماحول میں عربی بول چال کا ماحول پیدا نہیں کیا جاتا۔

۵- ہمارے معلمین بھی اپنے اسباق کے دوران کلاس میں ایسا عربی ماحول پیدا نہیں کرتے جس سے معلم اور طلبہ کے درمیان باہمی گفتگو میں عربی زبان کے روزمرہ محاورے استعمال ہوتے ہوں۔

اس طرح ہمارے طلبہ اور مدرسین دونوں کو عربی الفاظ یا عبارتوں کا مقامی زبان اردو یا پشتو وغیرہ میں ترجمہ تو یاد رہتا ہے لیکن عربی الفاظ کی سرسری قرأت کے بعد اس کے عملی استعمال کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ یوں ہم اپنے تمام اسباق میں اور تمام تعلیمی مراحل میں عربی زبان کو عملاً اور مسلسل ترک کرتے رہتے ہیں۔

اسلئے ہمارے طلبہ وطالبات بلکہ اساتذہ بھی عربی ایسی آسان زبان کو بھی لکھنے اور بولنے کی معمولی صلاحیت سے قاصر رہتے

ہیں۔اس فرسودہ طریقہ تدریس سے عربی زبان مسلسل ''متروک'' رہتی ہے۔اس لئے ہمارے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور اسلامی درسگاہوں میں عربی زبان عملاً ''متروک'' ہے۔اور یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جس چیز سے آپ زندگی بھر گریزاں رہیں بلکہ اسے آپ عمداً ترک کریں، وہ آسان ہونے کے باوجود آپ کو نہیں آئے گی۔

معلم کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے

محترم حضرات! میں نے بنیادی عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے جن چار مختلف طریقوں کا ذکر کیا ہے، ان سب میں ایسی نصابی کتابوں کی مثالیں دی ہیں جو ہمارے اپنے ملک یا علاقے میں لکھی گئی ہیں اور ان میں ہمارے اداروں اور ہمارے طلبہ وطالبات کی ضروریات اور معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور وہ یہاں زیر تعلیم ہیں۔لیکن اس کے باوجود ہر معلم کی مہارت، تجربے اور محنت کی بدولت اس کا طریقہ تدریس دوسرے سے یکسر مختلف ہے اور اس کے مقاصد اور نتائج بھی مختلف ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ

- تدریس کا پہلا طریقہ بالکل سادہ اور سطحی ہے، اور اس میں عربی عبارت کا صرف لفظی اردو ترجمہ سکھایا جاتا ہے۔
- دوسرے طریقے میں اردو ترجمہ کے ساتھ منتخب الفاظ کی تشریح سکھائی جارہی ہے۔
- جبکہ تیسرا طریقہ تدریس کئی طرح کی محنت اور منصوبہ بندی سے تیار کیا گیا ہے اور اس سے پانچ فوائد کی تکمیل ہورہی ہے۔(۱) بامحاورہ اردو ترجمہ، (۲) الفاظ کی تشریح، (۳) نطق کی تصحیح، (۴) عبارت کا مکمل فہم اور (۵) عربی لکھنے بولنے کی استعداد۔
- اسی طرح چوتھا طریقہ تدریس بھی بڑی مہارت اور توجہ سے تیار کیا گیا ہے۔یہ کسی زبان کی تدریس کا سب سے زیادہ مؤثر اور نہایت کامیاب طریقہ تدریس ہے، اور تمام مقاصد اور فوائد کی تکمیل کرتا ہے۔اس سے قارئین اردو ترجمہ کے بجائے براہ راست عربی زبان میں غور وفکر کرتے ہوئے اسے پڑھنے لکھنے اور بولنے کی مہارت حاصل کرتے ہیں۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿39﴾ (اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ انسان کو اس کی محنت کے مطابق ہی نتیجہ ملتا ہے)، بہرحال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت اور تدریس میں معیاری اور اچھی تدریسی کتاب کے ساتھ معلم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اس نکتے پر مزید گفتگو کسی دوسرے موقع پر کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مباحثہ ومکالمہ

جدید افکار ونظریات اور آرا وتعبیرات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات واحکام کے ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات، شکوک وشبہات اور علمی وفکری اعتراضات کے بارے میں ہمارے دینی حلقوں کا عمومی رویہ نظر انداز کرنے اور مسترد کر دینے کا ہے جس سے 'الشریعہ' کو اختلاف ہے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دینی حلقوں کے ارباب فکر ودانش اس طرف توجہ دیں، مباحثہ میں شریک ہوں، اپنا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کریں، جس موقف سے وہ اختلاف کر رہے ہیں، اس کی کمزوری کو علمی انداز سے واضح کریں اور قوت استدلال کے ساتھ اپنے موقف کی برتری کو واضح کریں، کیونکہ اب وہ دور نہیں رہا کہ کسی مسئلہ پر آپ اپنی رائے پیش کر کے اس کے حق میں چند دلائل کا تذکرہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جائیں کہ رائے عامہ کے سامنے آپ کا موقف واضح ہو گیا ہے اور آپ کی بات کو قبول کر لیا جائے گا۔ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے، تجزیہ واستدلال کا دور ہے اور معروضی حقائق کی تفصیلات وجزئیات تک رسائی کا دور ہے۔ آپ کو یہ سارے پہلو سامنے رکھ کر اپنی بات کہنا ہوگی اور اگر آپ کی بات ان میں سے کسی بھی حوالے سے کمزور ہوگی تو وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے گی۔

اسی مقصد کے تحت الشریعہ کے صفحات پر ''مباحثہ ومکالمہ'' کا یہ آزادانہ فورم قائم کیا گیا ہے جس کے تحت شائع ہونے والی تحریروں سے 'الشریعہ' کا اتفاق ضروری نہیں ہے اور اس میں کسی بھی علمی موضوع پر لکھی جانے والی کوئی بھی تحریر شائع کی جا سکتی ہے جو علمی اسلوب اور افہام وتفہیم کے لہجے میں مناظرانہ انداز اور طعن وتشنیع کے اسلوب سے ہٹ کر لکھی گئی ہو۔ اس ضمن میں روایتی مناظرانہ مسائل کے بجائے اسلام اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل ومشکلات کے حوالے سے جدید عنوانات پر لکھی گئی تحریروں کو ترجیح دی جائے گی، بلاوجہ تکرار سے گریز کیا جائے گا اور کسی بھی موضوع پر 'الشریعہ' میں شائع ہونے والے کسی مضمون یا مواد کو دوبارہ کسی اور عنوان سے شائع نہیں کیا جائے گا۔

علمی مباحثہ ومکالمہ ہمیشہ سے ہماری ضرورت رہا ہے اور آج کے دور میں معلومات اور خیالات کی وسعت وتنوع کے ماحول میں اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، اس لیے ہمیں امید ہے کہ اہل علم اس سلسلے میں سنجیدگی کے ساتھ 'الشریعہ' سے تعاون فرماتے رہیں گے۔

(رئیس التحریر)

مباحثہ ومکالمہ

محمد رفیق چودھری☆

امہات المومنین اور آیت حجاب کا حکم

اگست ۲۰۰۷ء کے ''الشریعہ'' میں جناب ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب کا مضمون ''امہات المومنین کے لیے حجاب کے خصوصی احکام'' نظر سے گزرا۔ جناب ندوی صاحب کے مذکورہ مضمون کی گئی باتوں سے مجھے اختلاف ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''قرآن میں پردہ کے کچھ احکام تو ایسے تو ہیں جن کا تعلق امہات المومنین یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے ہے اور دوسرے احکام وہ ہیں جو عام مسلمان خواتین سے متعلق ہیں اور بعض حکم ایسے ہیں جن میں دو نوں مشترک ہیں۔'' (ص: ۳۷)

مگر آگے چل کر ندوی صاحب نے اپنے عجیب وغریب نظریے کی وضاحت نہیں فرمائی کہ ان تین اقسام کے پردوں کے لیے قرآن وحدیث سے کیا دلیل ملتی ہے انہوں نے صرف ایک قسم کے پردے کی وضاحت کرتے ہوئے سورۃ الاحزاب آیت ۳۳ کا حوالہ دیا ہے باقی دو قسموں کے پردوں کے بارے میں نہ کوئی دلیل دی ہے اور نہ کوئی حوالہ بلکہ اس معاملے سے اعراض کر کے انہوں نے اس بحث میں اچھا خاصا الجھاؤ اور مغالطہ پیدا کر دیا ہے، کہ اسلام میں ستر وحجاب کے احکام ازواج مطہرات کے لیے اور ہیں اور عام مسلمان خواتین کے لیے اور۔

۲۔ جناب ندوی صاحب کے مضمون کا دوسرا نکتہ جس سے مجھے اختلاف ہے یہ ہے کہ انہوں نے سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۳ کے الفاظ: 'وقرن فی بیوتکن' (اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو...) کے حکم کو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے ساتھ خاص کر دیا ہے اور وہ اس حکم میں عام مسلمان عورتوں کو شامل نہیں سمجھتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''بعض مفسرین نے قدیم زمانے سے مذکورہ آیت ۳۳ کے پہلے جملے 'وقرن فی بیوتکن' (اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو) کا اطلاق عام مسلمان خواتین پر کر کے عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دیا''۔ (ص ۳۸)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

☆ مکتبہ قرآنیات، اردو بازار، لاہور

''عورتوں کو چار دیواری میں رکھنے کے دفاع میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ اپنی جگہ لیکن اس کا حکم قرآن میں نہیں ہے۔ اور ازواج مطہرات پر قیاس کرتے ہوئے اس حکم کو تمام مسلمان خواتین کے لیے عام کرنا کسی طرح درست نہیں، کیونکہ سورۃ الاحزاب کی انہی آیتوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ ازواج مطہرات میں سے اگر کوئی بدکرداری کرے تو ان کو آخرت میں دگنی دی جائے گی، اور اگر وہ اطاعت شعاری اور نیکوکاری کریں گی تو ان کو دگنا اجر دیا جائے گا (سورۃ الاحزاب آیت ۳۰۔۳۱) جب کہ عام مسلمانوں کو کسی گناہ کی سزا دینے کا ذکر قرآن میں نہیں''۔ (ص ۳۸)

اصل نکتے پر بحث کرنے سے پہلے میں عرض کروں گا کہ ندوی صاحب کا ای دعوی کہ عام مسلمانوں کو کسی گناہ کی دگنی سزا دینے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، ہرگز صحیح نہیں ہے۔ سورۃ الفرقان آیت ۶۸۔۶۹ میں عام مسلمانوں کو بھی تین قسم کے گناہوں (شرک، قتل اور زنا) پر آخرت کی دگنی سزا سنائی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذَالِكَ يَلْقَ أَثَاماً يُّضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَاناً

(الفرقان آیت ۶۸۔۶۹)

''اور جو شخص ایسے کام کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا، قیامت کے دن اسکو دگنا عذاب دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔''

اب اصل نکتے کی طرف آتے ہیں، یہ بجا ہے کہ سورۃ الاحزاب آیت ۳۳ میں 'وقرن فی بیوتکن' (اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو) کا خطاب اگرچہ ازواج مطہرات سے ہے مگر اس حکم میں عام مسلمان خواتین بھی داخل ہیں کیوں کہ اسی آیت میں نماز، زکوۃ، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت جیسے احکام بھی موجود ہیں جو ظاہر ہے صرف ازواج مطہرات کے ساتھ خاص نہیں ہو سکتے۔ پوری آیت یوں ہے:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِيْنَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً (الاحزاب آیت ۳۳)

''اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، دور جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنی زینت کی نمائش کرتی نہ پھرو، نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اللہ چاہتا ہے یہ کہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور رکھے اور تمہیں اچھی طرح پاک کر دے۔''

کیا اس آیت کا یہ مطلب لیا جائے کہ صرف ازواج مطہرات ہی گندگی سے پاک ہوں اور اللہ تعالیٰ باقی مسلمان عورتوں کو گندگی سے پاک نہیں کرنا چاہتا؟ مذکورہ آیت کے حوالے سے اگر ندوی صاحب کے موقف کو تسلیم کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ صرف امہات المومنین ہی کو اپنے گھروں میں ٹک کر رہنے کا حکم دیا گیا تھا، اور عام مسلمان خواتین کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ گھروں میں ٹک کر نہ رہا کریں بلکہ گلیوں اور بازاروں میں پھرتی رہا کریں۔ صرف امہات المومنین کے لیے حکم تھا کہ وہ تبرج جاہلیت سے پرہیز کریں اور عام مسلمان خواتین کو باہر ٹھن کر نکلنے کی اجازت ہے۔ صرف امہات المومنین کے حکم تھا کہ وہ امہات المومنین کو زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور عام مسلمان خواتین کے لیے زکوۃ کا حکم نہیں ہے۔ صرف

امہات المومنین کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور عام مسلمان خواتین کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اللہ و رسول کی نافرمانی کیا کریں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تمام مفسرین مانتے ہیں کہ اس آیت میں گھر میں ٹکے رہنے کا جو حکم ہے، وہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے دیا گیا ہے، مگر اس کے مفہوم میں عام مسلمان خواتین بھی شامل ہیں، مثال طور کے پر امام قرطبیؒ نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر قرطبی (الجامع لاحکام القرآن) میں اسی آیت کے تحت یہی لکھا ہے کہ ''معنی هذه الاية الامر بلزو م البيت، وان كان الخطاب لنساء النبی ﷺ فقد دخل غير هن فيه بالمعنى''۔

اسی طرح مذکورہ آیت کے تمام (چھ) احکام کا اطلاق ازواج مطہرات کے علاوہ عام مسلمان خواتین پر بھی کیا گیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمان گھروں میں جو اصلاح فرمائی تھی، اس کا آغاز سب سے پہلے ازواج مطہرات سے کیا گیا تا کہ وہ دوسروں کے لیے نمونہ عمل بن جائیں۔

۳۔ تیسری بات اس مضمون میں ندوی صاحب کا وہ طرز کلام ہے جو ان جیسے بزرگ اور عربیت کے ماہر شخص کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ: ''عورتوں کو چار دیواری میں رکھنے کے دفاع میں جو بھی کہا جائے وہ اپنی جگہ، لیکن اس کا حکم قرآن میں نہیں ہے۔'' (ص ۳۸)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''بعض مفسرین نے قدیم زمانے سے مذکورہ آیت کے پہلے جملے 'وقرن فی بیو تکن' (اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو) کا اطلاق عام مسلمان خواتین پر کر کے عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دیا.....'' (۳۸)

ان عبارات میں ''عورتوں کو چار دیواری میں رکھنے'' اور آیت کا اطلاق عام مسلمان خواتین پر کر کے ''عورتوں کو گھر میں محبوس کر دیا'' جیسی پھبتیاں کسنا ندوی صاحب کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دلدادگان کا شیوہ ہے۔ آخر ندویوں کے لیے کیوں لازم ہو گیا ہے کہ وہ بھی مغرب کی ہم نوائی میں پردہ جیسے اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے لگیں؟ شریعت نے پردے کا حکم عورت کو محبوس کرنے کے لیے نہیں دیا، اس کی عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے دیا ہے۔

ندوی صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اب کی اس پھبتی اور طعن و تمسخر کی زد کہاں تک پہنچی ہے۔ ان کی ان عبارات سے یہ تو نکلتا ہے کہ اصل میں اللہ تعالیٰ نے تو اپنے قرآن میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو گھر کی چار دیواری میں ''محبوس کرنے'' کا حکم دیا تھا، مگر کم فہم مفسرین نے اس خاص حکم کو عام قرار دے کر عام مسلمان خواتین کو بھی گھروں میں محبوس کر دیا۔ یا للعجب! کیا ایسی بات کہنے کے بعد کسی مسلمان کا ایمان محفوظ رہ سکتا ہے! محترم ندوی صاحب کو اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عربی ادب اور چیز ہے، اور دین کی سمجھ اور چیز!

۴۔ جناب ندوی صاحب کے مضمون کے آخری نکتہ جس سے مجھے اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ وہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ جسے آیت حجاب کہا جاتا ہے، کے حکم کو بھی ازواج مطہرات کے ساتھ خاص مانتے ہیں اور ان کو یہ شکایت ہے کہ مفسرین کرام نے اس خاص حکم کو بھی غلطی سے ساری خواتین کے لیے عام کر دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ آیت اپنے طرز خطاب اور اپنے سبب نزول کی روشنی میں واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج

مطہرات سے متعلق ہے لیکن اس کے آخری جملے ''اور جب ان (ازواج مطہرات) سے کچھ کہا مانگا کرو تو یہ پردے کے پیچھے سے مانگا کرو'' کا حکم بعد کے مفسرین نے ساری خواتین کے لیے عام کر دیا'' (ص؟؟)

قارئین کی آسانی کے لیے یہاں پر متعلقہ آیت حجاب بھی لکھ دی جاتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِيْنَ إِنَاهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعاً فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ...

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہیں چلا جائے کرو، نہ کھانے کا وقت تکتے رہو، ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ، مگر جب کھانا کھا لو تو چلے جاؤ، بیٹھ کر باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمہارا یہ عمل نبی کو تکلیف دیتا ہے، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے، اور اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا ہے، نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے مناسب طریقہ ہے''۔

اس سلسلے میں پہلی گزارش یہ ہے کہ جہاں تک طرز خطاب اور سبب نزول، کا معاملہ ہے، تو اہل علم جانتے ہیں کہ تفسیر کا یہ مسئلہ قاعدہ ہے کہ "العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب" جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن آیات کا کوئی خاص شان نزول ہوتا ہے، ان کا حکم بھی صرف مخصوص موقع ہی کے لیے ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کے حکم کو عام قرار دیا جاتا ہے۔ گویا یہ نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ فلاں آیت شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا اس کے بارے میں جو حکم آیا ہے، وہ بھی اسی شخص کے ساتھ خاص ہے بلکہ وہ حکم عام بھی ہو سکتا ہے، اور سبب کے لیے ہو سکتا ہے۔ یہی معاملہ اس آیت حجاب کا ہے۔ یہ اگرچہ اپنے طرز خطاب اور سبب نزول کے اعتبار سے خاص حکم رکھتی ہے مگر اس کے معنی و مفہوم میں عموم پایا جاتا ہے۔ روایات میں ہے کہ اس آیت حجاب کے نازل ہونے کے بعد ازواج مطہرات کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے تھے۔ پھر چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اس لیے سب مسلمانوں نے بھی اپنے گھروں پر پردے لٹکا دیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے بھی اس آیت کے حکم کو خاص نہیں سمجھا بلکہ عام سمجھ کر اس پر عمل کیا اور صحابہ کرام کی قرآن فہمی بعد والوں کی قرآن فہمی سے بہر حال مقدم ہے۔

دوسرے اس آیت کے آخری فقرے میں بھی اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ جو لوگ اپنے مردوں اور اپنی عورتوں کے دلوں کو پاک رکھنا چاہتے ہیں، وہ یہی طریقہ اختیار کریں جس کا یہ آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ پھر جہاں تک ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِن کی قرآنی حکمت کا تقاضا ہے تو کیا اسلام میں بھی صرف صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کے دلوں کی پاکیزگی مطلوب ہے، اور بعد میں آنے والے مسلمان مردوں اور عورتوں کے دلوں کی پاکیزگی اسلام کو مطلوب نہیں ہے؟ جس طریقے کے بغیر صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کے دلوں کی پاکیزگی میں کمی آ سکتی تھی، کیا اس طریقے کے بغیر جدوجہد میں آنے والے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے دلوں کی پاکیزگی میں کمی نہیں آ سکتی؟

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی☆

لال مسجد کا سانحہ، علماءِ عظام اور صدر مشرف

اسلام آباد کی لال مسجد کا نام مہینوں سے ہر اُس آدمی کو ذہنی پریشانی میں ڈالے ہوئے تھا جو اسلام اور اسلامی شعائر سے نام کا بھی جذباتی تعلق رکھتا ہو۔ دعائیں تھیں کہ اللہ کوئی بہتر حل کی صورت نکال دے۔ مگر دعاؤں پر تو مدت سے ہماری بداعمالیوں نے درِ اجابت بند سا کر رکھا ہے۔ سو، ۱۱ر جولائی کو ساری دعاؤں کے علیٰ الرغم یہ پریشانی ایک اتھاہ رنج والم میں جا بدلی۔ افہام وتفہیم کی کوششیں نہ صرف حکومت کی طرف سے ہوا کیں، پاکستان کے مؤقر ترین علماء کی طرف سے بھی مسجد اور اس سے وابستہ جامعۂ حفصہؓ کے ذمہ دار برادران (عبدالعزیز صاحب اور عبدالرشید صاحب) سے پیہم کہا جاتا رہا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیکر اسلام نافذ کرنے کی راہ سے واپس آجائیں۔ ورنہ اس کے نتائج تنہا ان کو نہیں، کم وبیش سب ہی اہلِ مدارس ومساجد کو خدانہ کردہ بھگتنا پڑیں گے۔ مگر نہ دعاؤں سے کچھ ہونا تھا نہ کوششوں سے۔

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

حکومت ایکشن میں آئی، اور وہ ہوا کہ اپنے تو اپنے وہ غیر بھی روئے جو حکومت پر لعنت برسا رہے تھے کہ لال مسجد والوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جا رہا، جبکہ انھوں نے حکومت اندرونِ حکومت قائم کر رکھی ہے اور سرِ عام لوگوں کے انسانی حقوق پامال کر رہے ہیں۔ اور تو اور، حقوقِ انسانی کی ایک عالمی شہرت یافتہ چیمپین خاتون عاصمہ جہانگیر جو وہاں ہوتی ہیں، اور بھرپور تنقید کرنے والوں میں شامل تھیں وہ بھی کہہ اُٹھیں ہیں کہ لوگ بیشک غلط تھے مگر مارے بھی غلط طریقے سے گئے۔ الغرض، مشکل ہی سے کوئی اس روشن خیال قبیلے میں نکل رہا ہے جو ایکشن کے بعد کہہ رہا ہو کہ ہاں ٹھیک ہوا۔ حد یہ ہے کہ پاکستان کی عدالتِ عالیہ (سپریم کورٹ) از خود اس معاملہ کا نوٹس لیکر حکام کو پے بہ پے ہدایات جاری کرنا اپنی ذمہ داری سمجھ رہی ہے کہ اس سلسلہ کے معاملات میں کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔

لال مسجد برادران حکومتی ایکشن (یا آپریشن) سے پہلے تک پوری سوسائٹی میں بالکل یکہ وتنہا (Isolate) تھے۔ کوئی قابلِ ذکر آدمی ان کی حمایت کو تیار نہ تھا۔ اور علماءِ دیوبند، جن سے ان برادران کا مسلکی رشتہ تھا ان کے اکابر نے تو اپنا سمجھانا کارگر نہ ہوتا پا کر ان سے بالکل قطع تعلق وبراءت کا اظہار اس حد تک کیا کہ اپنے مدارس کی تنظیم ''وفاق المدارس''

☆ سرپرست ماہنامہ الفرقان، لکھنو۔

سے ان کے مدرسوں (جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ) کا الحاق بالاعلان ختم کر دیا۔ اس سے زیادہ کسی دلیل کی ضرورت اس بات کے لیے نہ تھی کہ یہ دونوں برادران جو کچھ کر رہے اور اپنے طلباء وطالبات سے کرا رہے ہیں یہ ان کی ایک ایسی سوچ ہے جس کی تائید کی کوئی گنجائش ان کے اپنے علما بھی اپنے علم میں نہیں پاتے۔ اور ان مؤثر علماء کرام کے اس موقف کی روشنی میں بجا طور پر سمجھا جا سکتا تھا کہ بالفرض حکومت اُن کے ہاتھ میں ہوتی تو حکومت کی طاقت سے بھی وہ سب کچھ کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے جس سے ان برادران کے خلافِ قانون اقدامات پر روک لگائی جا سکے۔ اور کوئی جائز استغاثہ ان کے اقدامات کے سلسلہ میں پیش ہوتا تو اس کو بھی قابلِ شنوائی جانا جاتا۔

یہ ایک ایسی صورتِ حال رونما ہو رہی تھی جسے کہا جا سکتا تھا کہ ایک شر سے خیر کا ظہور ہوا چاہتا ہے۔ مدارس اور علماء مدارس جو تقریباً چھ سال سے اس شک وشبہے اور الزام کا نشانہ بنے ہوئے تھے (اور یہ زیادہ تر دیوبندی مدارس کے بارے میں تھا) کہ ان میں دہشت گردی کی بھی تربیت ہوتی یا اسکے جراثیم پیدا کئے جاتے ہیں، اس صورتِ حال سے بہت کچھ مدد یہ ثابت ہونے میں مل سکتی تھی کہ اس شک وشبہے کو عمومی نوعیت میں مدارس پر پھیلانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ مدارس اور علماء کے حوالہ سے اسلامی حکومت کے ''طالبانی تصور'' کا بنا ہوا تھا، وہ تصور جس کی ایک عملی نمائندگی لال مسجد برادران کرنے لگ گئے تھے، سو اس پر علماء عظام کی متفقہ اور بالاعلان نکیر نے کوئی گنجائش کسی کے لیے نہیں رہنے دی تھی کہ آئندہ اس کو علماءِ پاکستان کے حوالے سے زبان پر لایا جائے۔ مگر صدر مشرف صاحب کی حکومت، جو چھ ماہ سے یہ تأثر دینے میں لگی ہوئی تھی کہ وہ طاقت کا استعمال نہیں کرنا چاہتی، اس نے ایک دم سے طاقت کا وہ استعمال کر کے کہ جیسے ساری تأخیر واحتیاط کی تلافی کر دینا چاہتی ہو، اس (شر سے خیر نکلتی ہوئی) صورتِ حال کا قصہ آناً فاناً تمام کر دیا اور بھرپور توپ و تفنگ سے چڑھائی کر کے یکسر وہ ایک نئی فضا اس کے برعکس پیدا کر ڈالی کہ ''ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز۔'' ٹھیک ہے کہ ان برادران کا دستِ اصلاح وانکار اپنے لوگوں سے بڑھ کر غیر ملکی لوگوں (اور وہ بھی چینیوں) تک جا پہنچا تھا اور چینی حکومت اس پر فوراً اپنے سفیر کے ذریعہ حرکت میں آئی تھی، مگر پاکستان میں تو اب تک کتنے ہی چینی انجینئر قتل ہو چکے ہیں۔ یہاں تو قتل جیسا کوئی کیس بھی نہ تھا کہ ایک دم سے فوج کو حکمِ بزن دے دیا جائے، حتیٰ کہ اپنے بندے مرجانے کی بھی پروانہ کی جائے!

حکومت کے اس بے ہنگم وغیر متناسب (Inappropriate) اقدام نے خود اس کو تو ملزمین کے کٹہرے میں کھڑا کر ہی دیا ہے، اور اس کو وہی بھگتے گی، مگر یہاں سے علماء کرام کا جو یوٹرن سامنے آیا ہے کہ وہ سانحہ کے سلسلہ میں مسجد برادران کا حصہ بھلا کر ساری ذمہ داری حکومت پر ڈال رہے ہیں، وہ ہم جیسوں کے لیے تو لال مسجد قصہ کے انجام سے کم المیہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تمام بہتر صورتِ حال جو گزشتہ چھ ماہ میں اِن حضرات کے، یعنی دین کے مستند نمائندوں اور اداروں کے حق میں، ان کے ایک قدرے جرأت مندانہ موقف کی بنا پر پیدا ہونا شروع ہوئی تھی، اس کا قصہ بھی ان کی پوزیشن کی اس تبدیلی کے ساتھ یقیناً ختم ہو گیا۔ اور جتنی اطلاعات اب تک سامنے ہیں، جن میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے، ان کے مطابق کوئی معقول وجہ بھی نہیں بنتی کہ ۱۰/۱۱ جولائی کی رات میں جو کچھ ہوا، اس کی ذمہ داری میں لال مسجد برادران کا حصہ پسِ پشت ڈال کر محض حکومت کی مذمت کی جائے۔ پہلے دن (۱۱ جولائی) سے آج دمِ تحریر (۲۳ جولائی) تک کی

اطلاعات کے مطابق اس یوٹرن کی وجہ فقط یہ سامنے آ رہی ہے کہ اس رات میں سمجھوتے کا ایک ڈرافٹ (مسودہ) حکومت کے نمائندوں اور علماء کے نمائندوں کے اشتراک سے، بہ منظوری عبدالرشید غازی صاحب، تحریر ہوا۔ پھر وہ ڈرافٹ صدر مملکت کے پاس منظوری کے لیے گیا تو وہاں سے ترمیم کے ساتھ واپس آیا جس پر ''ہاں یا ناں'' کے لیے آدھا گھنٹہ یا (ایک روایت کے مطابق) بس پندرہ منٹ دیے گئے، کیونکہ فوج نے فائنل آپریشن کے آغاز کے لیے جو گھڑی مقرر کر رکھی تھی، اس کا وقت نکل رہا تھا۔ علماء کے نزدیک ترمیم پر فیصلہ کے لیے یہ وقت ناکافی تھا، اس لیے انھیں سمجھوتے کا کردار چھوڑ کر اُٹھ آنا پڑا، اور پھر ہوا جو ہوا۔

پاکستان کے علماء کرام اپنے معاملات کو سمجھنے میں یقیناً ہم سے بہتر پوزیشن میں ہیں، اور یوں بھی یہ معاملہ ایسی جذباتی نوعیت کا ہے کہ اس نوعیت کے معاملات میں باہر سے کوئی رائے زنی ناخوشگواری کا باعث ہو سکتی ہے۔ مگر حالات کے اس جبر کو کیا کہیے کہ پاکستانی مدارسِ عربیہ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم نے وہاں سے لے کر افغانستان ہی نہیں، ہندوستان اور برطانیہ تک کے واقعات کو ان مدارس سے جوڑ دیا ہے۔ اس لیے پاکستانی مدارس کا مسئلہ اب سب کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک اطمینان کا سانس لیا تھا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معاملے میں پاکستان کے اکابر اہلِ مدارس نے جو موقف اختیار فرمایا ہے، وہ ان شاء اللہ مخالف پروپیگنڈے کی طاقت توڑے گا اور مطلع کچھ صاف ہوگا۔ مگر اب ۱۱ جولائی کے بعد موقف میں جو تبدیلی یکا یک آئی ہے، ہمارا خیال ہے وہ بجائے خود ہی اس پروپیگنڈے کو بے حد تقویت نہ دے گی جس کا سحر ٹوٹنے کی امید ہم کر رہے تھے، بلکہ حکومتی آپریشن کے بے ہنگم پن نے جو حکومت مخالف انتقامی تشدد کی ایک اندھی لہر پاکستان میں دوڑائی ہے، اسے بھی اخلاقی تائید علما کے اس موقف سے ملے گی۔ اور مولانا عبدالعزیز صاحب جنھوں نے برقع میں نکل بھاگنے کا ننگ مجاہد علما کے نام کو لگایا (اور پھر وہی برقع پہن کر انٹرویو دینے کا دباؤ بھی قبول کر لیا) وہ جس طرح کی ''مجاہدانہ'' تقریر اپنے بھائی کی تدفین کے موقع پر کرتے سنے گئے، اس کا حوصلہ انھیں کہاں سے دستیاب ہوا مانا جائے گا؟ اور اس سب سے بڑھ کر وہ ہزاروں طلبہ و طالبات جن کے ذہن میں اسلام، جہاد اور شہادت کا ایک سفیہانہ اور گمراہانہ تصور ان برادران نے بٹھا دیا تھا اور اس کے المناک و یاس انگیز انجام سے امید ہو سکتی تھی کہ سمجھائے جانے پر یہ نوعمر سمجھ کی راہ پالیں اور پاکستان اور اسلامیانِ عالم کے لیے مزید مسئلہ نہ بنیں، یہ امید کیسے قائم رکھنا ممکن ہوگی اگر ان کے کان میں وہی آوازیں جائیں گی جو یہ سننا چاہ رہے ہوں گے؟

لال مسجد اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ ڈرافٹ کی وہ آخری شکل جو صدر مشرف کی ترمیمات سے بنی اور جس کے نتیجہ میں علمائے کرام سمجھوتے کی کوشش سے باہر آ گئے، وہ حسنِ اتفاق سے آج (۲۳ جولائی) کے اخبار جنگ کے ایک کالم کے ذریعہ ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ اسے دیکھ کر تو صرف اپنی بدقسمتی ہی اس کی ذمہ دار نظر آتی ہے کہ سمجھوتہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ جنگ کے اس کالم کے مطابق، جو پاکستان کے معروف صحافی حامد میر صاحب کا ہے، صدر کے منظور کردہ سمجھوتہ ڈرافٹ کی آخری اور حتمی شکل یہ بن گئی تھی کہ (۱) عبدالرشید غازی کو ان کے گھر میں رکھا جائے گا اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی، (۲) لال مسجد سے باہر آنے والے تمام لوگوں کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہوگی، (۳) جامعہ حفصہ

اور جامعہ فریدیہ کا مستقبل محکمۂ اوقاف، وفاق المدارس اور دیگر حکومتی اداروں کے مشورہ سے طے کیا جائے گا۔ حامد میر صاحب نے ڈرافٹ کی یہ آخری شکل اپنے نام جناب مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی کے ایک خط کے حوالہ سے، جو سمجھوتے کی اس کوشش میں علمائے کرام کے سربراہ تھے، درج کی ہے۔ ہمارے سامنے سمجھوتے کا ابتدائی مسودہ نہیں ہے، تاہم یہ سمجھنے سے ہم خود کو بالکل قاصر پاتے ہیں کہ مسوّدے کی یہ آخری شکل سابق سے کتنی بھی بدلی ہوئی رہی ہو، پھر بھی اس میں کا کون سا نکتہ ایسا تھا کہ اس کی بنیاد پر سمجھوتے کے کردار سے دستبرداری دے دی جائے؟

چھ مہینے جو کچھ لال مسجد سے ہوتا رہا اور خود حضرات علما اسے ناقابلِ قبول قرار دیتے رہے، اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سمجھوتے کی یہ دفعات کسی طرح بھی غیر منصفانہ اور کسی زیادتی پر مبنی کہے جانے کے قابل نظر نہیں آتیں۔ اس ڈرافٹ کے رد کیے جانے سے اندازہ ہوتا ہے، اور یاد آتا ہے کہ خبریں بھی اس طرح کی آئیں تھیں، کہ عبدالرشید غازی نے سیف پیسیج (Safe Passage) دیے جانے (یعنی جہاں اور جس طرح چاہیں، چلے جانے دیے جائیں) کی شرط پر ہتھیار ڈالنے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔ پہلے مسودہ کی سب سے اہم بات غالباً یہی رہی ہوگی مگر ایسی حالت میں کہ فوج کے کئی آدمی کام آ چکے تھے جس میں لیفٹیننٹ کرنل کے رتبہ کا افسر بھی تھا، کیا سربراہِ فوج صدر سے امید کی جانی چاہیے تھی کہ وہ اس سے زیادہ رعایت غازی صاحب کو دے دے کہ وہ (جیل میں نہیں) اپنے گھر میں نظر بند کیے جائیں گے؟ ہر چند کہ یہ تأثر و تبصرہ صدر مشرف صاحب کے حق میں جا رہا ہے، جبکہ ہم خود بھی ان کے طرزِ حکومت کے سلسلہ میں، بالخصوص دین کے حوالے سے، کلمۂ خیر کہنے کی گنجائش نہیں پاتے، مگر دین ہی کا کہنا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا (المائدہ:۸)	''اے ایمان والو کھڑے ہو اللہ کے لیے، گواہی دینے والے بن کر انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس پر نہ آمادہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو''

اور اس حکمِ الٰہی سے اگر اس راقم کے جیسے لوگ بھی اعراض کرنے لگ جائیں جن کو سال بھر تک آیۃٌ من آیات اللہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ (م ۱۹۵۷) کے حضور قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردان کی عزت ملی ہے، پھر کس کی شکایت کی جا سکے گی کہ وہ اس فرمان سے آنکھ چرا رہا ہے؟ (اللہ جانتا ہے، میں اپنے اس شرف کا اظہار بالکل مجبوراً کر رہا ہوں)

کیسے کہا جائے اور کیسے نہ کہا جائے کہ حکومتی آپریشن کے آثار سامنے آتے ہی غازی صاحب اور ان کے برادر بزرگ کو اوّلاً تو مسجد کے تقدّس اور طلباء و طالبات کے تحفظ کی خاطر خود کو حکومت کے حوالے کر دینا تھا کہ پھر جو کچھ بیتے ان پر بیتے، مسجد اور طلباء و طالبات پر گولہ بارود کا عذاب نہ آئے۔ دوسرے، وہ جب لڑنے اور جان دینے کو تیار ہو سکتے تھے تو جیل جانا اور عدالت کا سامنا کرنا کیا اس سے بھی کوئی مشکل بات تھی؟ وہ خود کو جب اس قدر برسرِ حق سمجھتے تھے کہ اپنے شیوخ واکابر کی بھی نہ سنیں، تب تو اس حق کے اظہار اور اثبات کے لیے سب سے بہتر ممکن جگہ عدالت کا کٹہرا ہی تھا۔ اور ہمارے بزرگوں نے تو اظہارِ حق کے اس پلیٹ فارم کی آواز کو ہمیشہ لبیک کہا اور بھرپور استعمال کیا ہے، اس سے گریز کر کے سیف پیسیج مانگنا یہ تو کسی بھی طرح قابلِ حمایت کردار نہیں بنتا۔

افسوس، جو نہ ہونا تھا وہ ہوا، اور اس میں صدر مشرف صاحب کے کردار کو بھی یقیناً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر محمد علی جناح سوٹ بوٹ کے آدمی تھے، مگر جب وہ قائدِ اعظم اور گورنر جنرل پاکستان بنے تو اس خطے کی روایات کا پاس کرتے ہوئے کوٹ پتلون کو شلوار اور شیروانی سے بدلا اور سر پہ ٹوپی لگائی۔ مشرف صاحب نے اس خطے کی روایات کا احساس و پاس رکھنے والوں کے اور اپنے بیچ میں پہلے ہی دن نفرت کی دیوار کھینچ دینے کو دو کتّے بغل میں سنبھالنا اس وقت ضروری سمجھا جب وہ بیرونی صحافیوں کو انٹرویو دے رہے تھے، اور اپنے لیے آئیڈیل بھی علی الاعلان ٹرکی کے روایت شکن مصطفیٰ کمال کو ٹھیرایا۔ یہ پاکستان کی جڑوں میں پلائی ہوئی دینی روایات کے خلاف اعلانِ جنگ کی زبان تھی، اور پھر زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ جو قرآن نے کہہ رکھا تھا کہ:

''جس کسی نے '' سبیلَ الْمؤمنین'' چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اپنایا تو ہم اس کو اسی راستے پہ چلائیں گے جس پر وہ چل دیا۔'' (النسآء: ۱۱۵)

موصوف کے اسی راہ پر چلتے چلے جانے کا سامان ستمبر ۲۰۰۱ کی ۱۱ کے بعد امریکہ کے دھمکی لپٹے اس سوال سے ہو گیا کہ ''ہمارے ساتھ یا ہمارے خلاف''؟ مشرف صاحب کا جواب تھا کہ ''آپ کے ساتھ!'' اور اس امریکہ کے ساتھ میں انھیں پیہم اپنوں سے نبرد آزمائی کی راہ پہ چلنا پڑا۔ لیکن اب یکا یک یہ صورت رونما ہوئی ہے کہ چھ برس سرد و گرم کا ساتھ نبھانے کے باوجود امریکہ خود مشرف صاحب ہی کی سلطنت میں ان کی مرضی کے خلاف کارروائی کو پر تول رہا ہے۔ وہ اس سے جس قدر بھی پریشانی کے عالم میں نہ ہوں، کم ہے۔ ان کے اردگرد کے لوگوں کے بیانات اس صورتِ حال کی صاف تصدیق کر رہے ہیں۔ وقت ہے کہ مشرف صاحب اپنی اپنائی ہوئی راہ (غیرَ سبیلِ المؤمنین) سے تائب ہو کر راہِ مؤمنین کی طرف واپس آئیں اور اللہ سے مدد کے طالب ہوں، کہ اس کی مدد کے سامنے امریکہ یا غیرِ امریکہ کی طاقت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہماری تاریخ میں اس کی نظیریں موجود ہیں کہ حکمراں نے تائب ہو کر اللہ کے سامنے قوم کی حفاظت و عزت کے لئے زمین پہ ماتھا رگڑا تو معرکہ کے نتائج بڑی طاقت کے حق میں نہیں اس کے حق میں نکلے۔ مشرف صاحب ماشاء اللہ حج سے بھی مشرف ہو چکے ہیں، عمرے بھی شاید کئی کر لیے ہیں اور کعبۂ مقدسہ میں قدم رکھ پانے کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے ہیں۔ ان کے لیے رجوع الی اللہ مشکل نہ ہونا چاہیے۔ اور یہ ان کا وہ قدم ہوگا کہ قوم سے ان کی بگڑی ہوئی بھی بن جائے۔

مشرف صاحب ابھی کچھ دن پہلے اسی لندن میں، جہاں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، کہہ چکے ہیں کہ امریکہ کے ''ہاں یا ناں'' والے سوال کے جواب میں ان کی ''ہاں'' محض قوم کی خاطر ڈر سے تھی، ورنہ ان کی تربیت ڈرنے کی نہیں لڑنے کی ہے۔ یہ بات موصوف نے اس سوال کے جواب میں کہی تھی کہ لال مسجد کے خلاف ایکشن لینے سے وہ کیوں ڈر رہے ہیں اور ان الفاظ میں کہی تھی کہ ''ہاں، صرف ایک دفعہ ڈرا ہوں، اور یقین جانو صرف قوم کی خاطر''۔ اور اس ایک دفعہ کا مطلب صاف ظاہر تھا۔ تو بسم اللہ، اب وہ اس نئی آزمائش کو ''ڈر جانے'' کی عار سے دامن صاف کرنے کا موقع سمجھیں اور رجوع الی اللہ کی طاقت پہ ایمان لائیں۔ اللہ ان کے لیے آسان کرے۔

مکاتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مدظلہ العالی (صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یکم جولائی سے شروع ہو کر ۱۰ر جولائی کی صبح پانچ بجے تک کربلائے اسلام آباد میں آتش وآہن کی بارش برسا کر قوم کی معصوم، عفت مآب بیٹیوں، حفاظ قرآن اور غازی عبدالرشید شہید کے خاندان کے ۱۹ر افراد سمیت سیکڑوں طلبہ وطالبات کو جس بے دردی اور سفاکی سے شہید کیا گیا، اس کی نظیر چنگیز، ہلاکو، ہٹلر اور بوسنیا ہرزگوینا اور چیچنیا، عراق، ویت نام، کشمیر، فلسطین میں بھی نہیں ملتی۔ ظلم واستبداد کی اس داستان کو رقم کرنے میں جہاں موجودہ حکومت کا کردار اظہر من الشمس ہے، وہاں اس ظلم کو روکنے کے لیے جمعیت علماے اسلام کی قیادت، خطباے اسلام آباد اور دینی طبقات کی مجموعی کارکردگی انتہائی مایوس کن رہی۔

جناب صدر وفاق! فقیر کے آپ کی خدمت عالیہ میں بصد ادب واحترام چند سوالات پیش خدمت ہیں۔ ان پر غور کر لیجیے۔ مجنوں کی بڑ سمجھ لیجیے، مگر شاید کوئی ایک کام کی بات بزرجمہرانِ جمعیت اور وفاق کے پلے پڑ جائے:

۱۔ غازی برادران نے فحاشی کے خلاف جس جرات کا مظاہرہ کیا اور غاصب حکمران کی بے دین پالیسیوں کے خلاف جس طرح انہوں نے حق کا بول بولا کرنے کی خاطر استقامت کا مظاہرہ کیا، کیا یہ ایسے جرائم تھے کہ ان کی پاداش میں جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا وفاق سے الحاق ختم کر دیا جاتا؟

۲۔ وفاق کے ضوابط کار کی کون سی دفعہ کی خلاف ورزی کی گئی تھی جس کی یہ سزا دی گئی؟

۳۔ کیا سب سے پہلا وار وفاق نے نہیں کیا کہ دونوں مدرسوں کو اچھوت بنا کر حکومت کو اشارہ دے دیا گیا کہ ہمارا ان کے مطالبات اور اعمال سے کوئی تعلق نہیں؟

۴۔ وفاق کے بقراطوں کے پاس سوائے اخراج کے کوئی ہتھیار نہ تھا، ورنہ شاید وفاق المدارس خود وہی کردار ادا کرتا جو حکومت نے کیا۔

۵۔ ایک بجے تک وفاق نے اس ٹیم سے کیوں مذاکرات کیے جس کے پاس کوئی اختیار نہ تھا؟ کیا مفتی رفیع عثمانی صاحب، عبدالرزاق اسکندر صاحب، زاہد الراشدی صاحب، فضل الرحمٰن خلیل صاحب اور دیگر حضرات نے اس امر کی کوئی یقین دہانی حکومت سے حاصل کی تھی کہ جو شرائط مصالحتی مذاکراتی ٹیم طے کرے گی، وہ حکومتی ٹیم صدر کے بغیر خود منظور کرے

گی اور اس پر عمل درآمد کرائے گی؟ جناب رفیع عثمانی صاحب نے خود ٹی وی پر یہ بیان دیا کہ سی این سی ہاؤس سے مسودہ تبدیل کر دیا گیا اور حکومتی مذاکراتی ٹیم نے اس مسودے میں کسی بھی قسم کی لچک کا مظاہرہ کرنے سے معذوری ظاہر کر دی، تب ہم اٹھ کر چلے آئے۔

۶۔ علامہ زاہد الراشدی صاحب نے خود اپنے تحریر کردہ مقالات میں فرمایا کہ ہم نے فون بند کر دیے اور سو گئے۔ کیا آگ اور خون کے اس طوفان میں سونے والے مخلص کہلا سکتے ہیں؟

۷۔ حادثہ کے اختتام سے آج تک وفاق کے علما کا کوئی وفد فقط تعزیت کی غرض سے بھی مولانا عبد العزیز سے ملاقات کے لیے نہیں گیا۔ کیا یہ سنگ دلی کی انتہا نہیں؟ کیا یہ اس بات کا بین ثبوت نہیں کہ مذاکراتی ٹیم کے علمائے کرام، جمعیت علمائے اسلام کے قائد مولانا فضل الرحمٰن صاحب سمیت دیگر علما نے مولانا سے تعزیت نہ کر کے اور ان کی بے گناہ معصوم خواتین کے ساتھ عملاً اظہار ہمدردی نہ کر کے اس ظالمانہ آپریشن کو سند توثیق عطا فرما دی؟

۸۔ کیا اس طرح علمائے دیوبند کی روایتی جرات اور جذبہ حق پرستی کی نفی نہیں کی گئی؟ آج تک قائد حزب اختلاف اور ذمہ دارانِ وفاق صدر سے ملاقات کر کے مقدمات کی واپسی، مولانا کی بحالی، جامعہ حفصہ کی تعمیر نو کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ کیا ان کی ملاقات پر پابندی تھی؟

۹۔ لاپتہ طالبات اور طلبہ کے بارے میں وفاق اور قائد جمعیت نے کیا کردار ادا کیا؟

۱۰۔ ۱۸/اگست کو راقم الحروف پندرہ علما کے ساتھ مولانا عبد العزیز سے وزیر داخلہ کے توسط سے سملی ڈیم ریسٹ ہاؤس میں ملا۔ مولانا عبد العزیز کا یہ کہنا تھا کہ اخراج کے باوجود ہم وفاق کے علما کا احترام کرتے ہیں اور میں صرف یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ جس مقصد کے لیے دینی ادارے قائم کیے گئے ہیں، ان مقاصد کو بروئے کار لایا جائے اور منکرات کے سد باب کے لیے علما اٹھ کھڑے ہوں۔

۱۱۔ میں آپ پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حافظ حسین احمد آف مردان اور زاہد قاسمی صاحب نے جب وزیر داخلہ کے سامنے وفاق کے ذمہ داران کے کردار کا ذکر کیا تو فقیر نے فوری مداخلت کی اور وزیر داخلہ سے مندرجہ ذیل گفتگو کی:

جناب وزیر داخلہ! وفاق ہمارا گھر ہے، ہم اپنے شکوے اپنوں سے اپنے گھر میں بیٹھ کر کریں گے، نہ ہم آپ کو قائد سمجھتے ہیں نہ تھانیدار۔ ہم صرف اس لیے آئے ہیں کہ اس وقت پورے ملک میں حکومت اور فوج جیسے عظیم اور ملک کے دفاعی ادارے کے خلاف عوام الناس، علما اور طلبا کے دلوں میں نفرت کا جو طوفان ہے، اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟ آفتاب شیر پاؤ نے کہا کہ آپ ہی بتائیے۔ میں نے عرض کیا کہ اس عظیم حادثے کا واحد مرہم یہ ہے کہ:

۱۔ صدر مملکت مولانا عبد العزیز، ان کے اہل خانہ اور شہید طلبا وطالبات کو اہل خانہ سمیت سی این سی ہاؤس میں بلائیں، اظہار افسوس کریں، تعزیت کریں، ان کے سر پر دست شفقت رکھیں۔

۲۔ مولانا کو مسجد کی خطابت پر بحال کریں، جامعہ حفصہ کی تعمیر نو کریں۔

۳۔ دینی مدارس کی خدمات کے حوالے سے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کریں۔

۴۔ اس آپریشن میں شہید ہونے والوں کے لیے تعزیت کریں اور فاتحہ خوانی کریں۔

۵۔ملک سے بے حیائی اور مغربی کلچر کے خاتمے اور اسلامی طرز حیات کے لیے دستور پاکستان میں موجود دفعات پر عمل درآمد کرائیں۔

۶۔علما کی تذلیل وتحقیر اور مدارس کے خلاف خفیہ اداروں کی سرگرمیوں کو بند کریں۔

۷۔علماے کرام کا کنونشن بلائیں اور انہیں یقین دلائیں کہ آئندہ مدارس کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوگی۔

۸۔شہید مساجد کو تعمیر کریں اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو فوج، حکومت، عوام اور مذہبی طبقات کے تصادم کا ایسا سلسلہ چل نکلے گا جسے نہ فوج روک سکتی ہے نہ سیاست دان۔

اس گفتگو کے بعد ہمیں سرکاری گاڑی میں مولانا کی ملاقات کے لیے سملی ڈیم ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا جہاں مولانا تمام علما سے گلے ملے، شہدا کے لیے دعا مانگی گئی۔ مولانا کے ساتھ حافظ حسین احمد صاحب نے وفاق کے گلے شکوے شروع کیے جس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ سب ہمارے بزرگ ہیں، بس آپ سب لوگ میری بحالی، جامعہ حفصہ کی تعمیر نو اور اسلامی نظام کے نفاذ کی کوشش کریں، یہی ہماری قربانیوں کا صلہ ہے۔ انہوں نے آئی جی، کمشنر اور کمانڈوز کے سامنے علما سے فرمایا کہ یہ پہلا وفد ہے جو مجھ سے ملنے آیا ہے۔ وفاق نے یا قائد جمعیت نے اور علماے اسلام آباد نے حادثے کے بعد ہمیں اچھوت سمجھ کر ملاقات تک نہیں کی۔ ان حضرات نے اتنی اخلاقی جرات کا مظاہرہ نہیں کیا کہ اظہار تعزیت کے لیے آجاتے۔ اب تو آپریشن نہیں ہو رہا۔

جناب صدر وفاق! کیا وفاق، چیف جسٹس کی حمایت میں اٹھنے والے وکلا کی جدوجہد کے دسویں حصے جتنی جدوجہد کے قابل بھی نہ تھا؟ کسی کو حکومتی ایجنٹ کہنے سے وفاق اپنی کاہلی اور نااہلی پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ اگر اس طرح کے طعنے اپنوں کو دیے جانے لگے تو پھر وہ تحریر اخبارات کی زینت بن سکتی ہے جو وزارت داخلہ میں آپ کے، مولانا حنیف جالندھری، حسن جان صاحب، قاضی عبدالرشید صاحب اور انوار الحق صاحب کے دستخطوں کے ساتھ موجود ہے، جس میں لکھ کر دیا گیا ہے کہ ہمارا ان دونوں بھائیوں سے کوئی تعلق نہیں اور ہم ان کے اعمال کی مذمت کرتے ہیں۔

جناب شیخ! راقم نہ پہلے کسی ایکشن کمیٹی کا ممبر تھا، نہ اب ہے۔ نہ کبھی حکومت کی ایجنٹی کی ہے، نہ ایسا سوچ سکتا ہے، لیکن آپ تک اپنے اور اپنے عوام کے جذبات پہنچانا میرا اخلاقی، مذہبی، منصبی فریضہ ہے۔

حضرت الشیخ! 'ربما صرع الاسود الثعلب'، کبھی لومڑیاں شیروں کو شکست دے دیتی ہیں۔ حیا اور اخلاق اگر ہمارے علما کے دلوں سے رخصت نہیں ہو گیا تو مولانا کی رہائی، مقدمات کے اخراجات، ان کی رہائش، گمشدہ طالبات کی بازیابی، ان کی والدہ کی لاش کی سپردگی جیسے معاملات پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تلخ نوائی معاف۔

خاک پائے اکابر

قاضی محمد رویس خان ایوبی

سابق ضلع مفتی میرپور

خطیب مسجد اقصیٰ میرپور، آزاد کشمیر

''ملی مجلس شرعی'' کا قیام

تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ لاہور ایک اسلامی انجمن ہے جو جدید تعلیم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو مزید موثر اور مفید بنانے کے لیے علمائے کرام کے تعاون سے مختلف سطح پر کوششیں کرتی رہتی ہے۔ ۳؍اگست ۲۰۰۷ء کو تحریک نے لاہور میں دینی مدارس کے مہتمم حضرات کا ایک اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت ماہنامہ 'الشریعۃ' کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی نے کی۔ اس اجلاس میں مغربی فکر وتہذیب کے حوالے سے بعض نئی کتابیں لکھوانے اور دینی مدارس میں داخل نصاب کرنے کا معاملہ زیر بحث آیا۔ اس نشست میں، جس میں سارے مکاتب فکر کے علمائے کرام اور بعض دینی اسکالرز بھی موجود تھے، اس ضرورت کا احساس سامنے آیا کہ ایک قومی بلکہ ملی سطح کی علمی وفکری مجلس ایسی ہونی چاہیے جس میں ہر مکتب فکر کے جید علمائے کرام اور معتدل مزاج اسلامی اسکالرز شامل ہوں اور جو مسلم معاشرے کو درپیش فقہی وفکری مسائل میں عوام کی راہنمائی کرے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اس طرح کی ایک علمی مجلس تشکیل دینے کے لیے تاسیسی اجلاس جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو لاہور میں بلایا جائے جس میں مندرجہ ذیل علمائے کرام کو شرکت کی دعوت دی گئی:

۱۔ مولانا زاہد الراشدی، ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ
۲۔ مولانا حافظ فضل الرحیم، نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ، لاہور
۳۔ مولانا عبد الرؤف فاروقی، مہتمم جامعہ اسلامیہ، کامونکی
۴۔ مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی، مہتمم جامعہ نعیمیہ، لاہور
۵۔ مولانا مفتی محمد خاں قادری، مہتمم جامعہ اسلامیہ، لاہور
۶۔ مولانا محمد صدیق ہزاروی، شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور
۷۔ مولانا حافظ عبد الرحمٰن مدنی، جامعہ لاہور اسلامیہ، لاہور
۸۔ مولانا ارشاد الحق اثری، ادارۂ علوم اثریہ، فیصل آباد
۹۔ مولانا صلاح الدین یوسف، دار السلام، لاہور
۱۰۔ مولانا عبد المالک، شیخ الحدیث مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
۱۱۔ ڈاکٹر محمد امین، تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، لاہور

۱۲۔ محمد رفیق چودھری، مکتبہ قرآنیات، لاہور

۱۳۔ احمد جاوید، اقبال اکیڈمی، لاہور

۹ راگست ۲۰۰۷ء کو حسب پروگرام جامعہ نعیمیہ لاہور میں علماے کرام کا اجلاس ہوا جس میں ''ملی مجلس شرعی'' کے نام سے ایک علمی وفکری مجلس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ متفقہ طور پر مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کو اس مجلس کا کنوینر اور راقم کو اس کا رابطہ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ مفتی محمد خان قادری صاحب اور مولانا عبد المالک صاحب بیرون شہر ہونے کی وجہ سے اور مولانا فضل الرحیم صاحب اور احمد جاوید صاحب دیگر ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے۔ (مولانا فضل الرحیم صاحب نے اپنی طرف سے گفتگو کے لیے مولانا فہیم الحسن تھانوی صاحب کو بھجوایا) علماے کرام نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ دینی مدارس کے امتحانات اور رمضان المبارک کی وجہ سے مجلس کا پہلا ورکنگ اجلاس عید الفطر کے بعد ہوگا جس میں میڈیا (پرنٹ اور الیکٹرانک) سے متعلق مسائل پر غور وخوض کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ اس مجلس کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ مسلم معاشرے کو جن جدید مسائل کا سامنا ہے، ان کے حوالے سے سب مکاتب فکر کے علما کا ایک متفقہ اجتماعی موقف سامنے لایا جائے تاکہ علماے کرام کے بارے میں فرقہ وارانہ اختلافات کا تاثر دور ہو سکے، مغربی فکر وتہذیب کے خلاف بند باندھا جا سکے، امت کو روشن خیال اور مغرب سے مرعوب متجددین کی مخدوش فکر سے بچایا جا سکے اور عامۃ الناس خصوصاً جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا اس بات پر اعتماد بحال کیا جائے کہ اسلام آج بھی ان کے سارے مسائل کا حل پیش کرتا ہے اور علماے کرام آج بھی امت کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ مجلس مستقبل میں اسلامی مباحث کے حوالے سے وقیع کردار ادا کرے گی، ان شاء اللہ۔

(ڈاکٹر محمد امین، رابطہ سیکرٹری ملی مجلس شرعی
۱۳۶۔ نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور)

مولانا زاہد الراشدی کی بیرونی سفر سے واپسی

الشریعہ اکادمی کے ڈائریکٹر اور ''الشریعہ'' کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی چالیس روزہ بیرونی دورہ مکمل کر کے گوجرانوالہ واپس پہنچ گئے ہیں۔ وہ ۱۳ راگست سے ۲۳ راگست تک سعودی عرب میں رہے اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں مختلف دینی اجتماعات میں شریک ہوئے جبکہ ۲۳ راگست سے ۲۳ ستمبر تک انھوں نے امریکہ میں قیام کیا اور واشنگٹن، بالٹی مور، نیو یارک، باسٹن، ہیوسٹن، پراوی ڈنس اور دیگر مقامات میں درجنوں اجتماعات میں شرکت کی اور خاص طور پر دار الہدیٰ، اسپرنگ فیلڈ واشنگٹن میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع پر مسلسل پانچ روز لیکچر دیے اور مکی مسجد بروک لین نیو یارک میں ''قرآن کریم کے حقوق اور فہم قرآن کریم کے تقاضے'' پر چھ لیکچر دیے۔

الشریعہ اکادمی کی مطبوعات

دینی مدارس کا نصاب ونظام

نقد ونظر کے آئینے میں

☆ از قلم: ابوعمار زاہد الراشدی ☆

صفحات: ۴۱۶ ۔ قیمت: ۲۷۰ روپے

دینی مدارس اور عصر حاضر

(الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام فکری نشستوں اور تربیتی ورکشاپس کی روداد)

☆ ترتیب: شبیر احمد خان میواتی ☆

صفحات: ۲۴۰ ۔ قیمت: ۱۸۰ روپے

جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر کے ساتھ ایک علمی وفکری مکالمہ

☆ ابوعمار زاہد الراشدی / معز امجد / خورشید ندیم / ڈاکٹر فاروق خان ☆

صفحات: ۲۰۰ ۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

قرارداد مقاصد کا مقدمہ

(حاکم خان کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کا جائزہ)

سردار شیر عالم خان / چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ

صفحات: ۲۰۸ ۔ قیمت: ۱۲۰ روپے

جامعہ حفصہ کا سانحہ

(حالات وواقعات، اثرات ونتائج اور دینی قیادت کا لائحہ عمل)

☆ ابوعمار زاہد الراشدی ☆

صفحات: ۱۲۸ ۔ قیمت: ۶۰ روپے

حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل

☆ از قلم: ابوعمار زاہد الراشدی ☆

صفحات: ۱۵۲ ۔ قیمت: ۱۲۰ روپے

☆ ہمارے دینی مدارس: چند اہم سوالات کا جائزہ (ابوعمار زاہد الراشدی) صفحات: ۸۸/ قیمت: ۳۶ روپے

☆ مغرب کا فکری وتہذیبی چیلنج اور علما کی ذمہ داریاں (ڈاکٹر محمود احمد غازی) صفحات: ۳۶/ قیمت: ۲۰ روپے

☆ حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل (ابوعمار زاہد الراشدی) صفحات: ۸۸/ قیمت: ۳۶ روپے